سردار ولّبھ بھائی پٹیل

وشنو پربھاکر



ینگ انڈیا لائبریری

سردار ولّبھ بھائی پٹیل

اس کتاب میں شامل تصویروں کی اشاعت کے لیے ہم مندرجہ ذیل اداروں کے شکرگذار ہیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر جن اداروں کا ذکر نہ ہو سکا ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔

پبلی کیشنز ڈویژن، وزارتِ نشر و اشاعت
ایسوسی ایٹڈ پریس فوٹوز، دہلی
گاندھی میموریل میوزیم، دہلی
نوجیون ٹرسٹ، احمد آباد
نہرو میموریل میوزیم اور لائبریری، نئی دہلی
پنجاب فوٹو سروس، نئی دہلی
پی، آئی، بی
پی۔ ان۔ ورما اینڈ کمپنی، الہ آباد
سروودے دِوس کمیٹی
ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن، حکومتِ گجرات

ینگ انڈیا لائبریری

سردار ولّبھ بھائی پٹیل

وشنو پربھاکر

مترجم

نشاط قیصر



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

نئی دہلی

(1900) 1978

قیمت : 7/50

SARDAR VALLAB BHAI PATEL

تقسیم کار :-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی 110025 ، اُردو بازار دہلی 110006
پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003 ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ ، انڈیا A/5 گرین پارک نئی دہلی 110016 نے
لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دلی 110002 میں چھپوا کر شائع کیا۔

دولفظ

سردار ولبھ بھائی پٹیل کی وسیع عملی زندگی کو ان تھوڑے سے صفحات میں سمیٹنا ایک مشکل کام تھا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا تھا۔ کیا چھوڑیں، کیا شامل کریں، پھر بھی مندرجہ ذیل کتابوں اور چند مضامین کی مدد سے ایسا کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

1 سردار ولبھ بھائی از نرہری پاریکھ (دو حصے)
2 ہند کے سردار از راؤجی بھائی پٹیل
3 سردار ولبھ بھائی پٹیل از ایشور بھائی پٹیل
4 مہادیو بھائی کی ڈائری

ان کے علاوہ محترم پرکاش ویر شاستری، وی. شنکر اور سابق صدر ہند شری وی. وی. گری کے چند مضامین۔

مصنّف ان سب کا شکر گزار ہے۔

وشنو پربھاکر

ترتیب

ہونہار بروا

پہلا منظر:

استاد پریشان ہے۔ ریاضی کا ایک سوال حل ہی نہیں ہو رہا ہے۔ تبھی اچانک اس جماعت کا ایک لڑکا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ "آپ یہ سوال حل نہیں کر سکتے؟" یہ سنتے ہی اُستاد چڑ جاتے ہیں "تو تم کر دو نا تم ہی استاد بن جاؤ!"

وہ لڑکا ذرا بھی نہیں جھجکتا۔ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ سوال حل کرتا ہے اور استاد کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

باپ رے، یہ ہمت! استاد مارے غصّے کے لرزنے لگتے ہیں۔ شکایت لے کر ہیڈ ماسٹر کے پاس جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر لڑکے کو بلا کر پوچھتے ہیں۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

لڑکا بڑے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیتا ہے: "کیونکہ انھوں نے کہا تھا" ہیڈ ماسٹر سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ پھر بھی کہتے ہیں: "نہ .... نہ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر ایسی حرکت کی تو اسکول سے نکال دیے جاؤ گے۔"

لڑکا ایک بار ہیڈ ماسٹر کی جانب دیکھتا ہے اور پھر کہتا ہے: "نکالنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، ایسے اسکول سے میں ابھی چلا جاتا ہوں۔"

دوسرا منظر:

طالب علموں کا ایک گروہ پڑھنے کے لیے اپنے گانو سے چھ سات میل کی دوری پر واقع

ایک دوسرے گانو جا رہا تھا۔ یہ گروہ روز ہی اس راستے پر چلتا تھا۔ اس روز چلتے چلتے ساتھیوں کو ایسا لگا کہ ایک ساتھی کم ہے۔ تلاش کرنے پر پتا چلا کہ وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ پکارا: "تم وہاں کیا کر رہے ہو؟" اس طالب علم نے وہیں سے جواب دیا، "ٹھہرو، ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے زمین میں گڑے ہوئے ایک کھونٹے کو پکڑا، اسے زور سے ہلایا، اکھاڑا اور ایک جانب پھینک دیا۔ پھر اپنی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ ایک ساتھی نے کہا "تم نے اس کھونٹے کو کیوں اکھاڑ دیا؟ وہ تو کھیت کی حد بتانے کی غرض سے کسی نے گاڑا تھا۔"

اُس طالب علم نے کہا: "لیکن وہ راستے کے درمیان گڑا ہوا تھا۔ چلنے میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔ جو راستے کی رکاوٹ بنے اس کھونٹے کو نکال پھینکنا چاہیے۔"

تیسرا منظر:

ایک دن ماسٹر صاحب کلاس میں پڑھانے نہیں آئے۔ دفتر میں بیٹھے گپیں مارتے رہے۔ طلباء نے کچھ دیر تو انتظار کیا، پھر ان لوگوں نے گانا شروع کر دیا۔ آواز دفتر تک پہونچ گئی۔ اُستاد دوڑے دوڑے آئے اور لگے طالب علموں کو ڈانٹنے۔ ہمارے اس لڑکے کو یہ اچھا نہ لگا۔ کہنے لگا "آپ ہمیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں؟ آپ کلاس میں کیوں نہیں آئے، دفتر میں گپیں کیوں مارتے رہے۔ پھر ایسے میں ہم کیا کرتے؟ گاتے نہیں تو کیا روتے؟"

اُستاد یہ سُن کر اور بھی بھڑک اُٹھے۔ انھوں نے اس لڑکے کو کلاس سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ لڑکا اٹھا، اپنی کتابیں سنبھالیں، پھر اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور کلاس سے باہر چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اُستاد نے حیرت سے دیکھا کہ کلاس کے سبھی لڑکے باہر جا چکے تھے۔

دوسرے دن بھی وہ کلاس میں نہیں آئے۔ اُستاد پریشان تھے۔ وہ پھر ہیڈ ماسٹر کے پاس جا پہونچے۔ ہیڈ ماسٹر نے طلبا کو بلا کر کہا۔ "اپنے اُستاد سے معافی مانگو۔"

اس لڑکے نے جواب دیا۔ "جناب! یہ تو اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات ہوئی۔ ہمارا کوئی قصور نہیں۔ غلطی ماسٹر صاحب کی ہے۔ اگر معافی کسی کو مانگنی ہے، تو انھیں۔"

ہیڈ ماسٹر حیرت زدہ رہ گئے، مگر وہ تھے سمجھدار۔ انھوں نے مزید کچھ کہے بغیر لڑکوں سے کلاس میں جانے کے لیے کہا اور پھر وہ سب فخر سے مُسکراتے ہوئے کلاس میں جا بیٹھے۔

چوتھا منظر:

ایک بار اس لڑکے کی بغل میں ایک زہریلا پھوڑا نکل آیا۔ اس زمانے میں گاؤں دیہات میں عملِ جرّاحی کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ایسے پھوڑوں کو بس گرم لوہے سے داغ دیا جاتا تھا۔ وہ لڑکا بھی اپنے پھوڑے کے علاج کی غرض سے نائی کے پاس گیا۔ نائی نے لوہے کی سلاخ گرم ہونے کے لیے آگ پر رکھ دی۔ وہ لڑکا اس سلاخ کو سرخ ہوتا ہوا دیکھتا رہا اور ذرا بھی نہیں گھبرایا، مگر نائی جھجھک سا گیا کہ سُرخ دہکتی سلاخ اس لڑکے کے پھوڑے میں کیسے اُتارے۔ تب ہی وہ لڑکا گرج اٹھتا ہے:
" دیر کیوں کر رہے ہو؟ سلاخ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

نائی ہمّت کرتا ہے۔ لیکن ایک بار میں سارا مواد نہیں نکل پاتا ہے۔ نائی دوبارا داغتے ہوئے ڈرتا ہے۔ لڑکا اسی عزم کے ساتھ کہتا ہے۔ "تم سے نہیں ہوتا تو مجھے دو۔"

اور وہ دہکتی سلاخ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ پھوڑے کے اندر چاروں طرف گھماتا ہے جس سے سارا مواد باہر آجاتا ہے۔

پانچواں منظر:

وہی لڑکا ایک دن وکیل بن گیا۔ وکیل صاحب کے ہاتھ میں قتل کا ایک سنگین مقدمہ تھا، ذرا سی بھول ہوئی اور ملزم پھانسی کے تختے پر پہونچا۔ اسی لیے وہ جی جان سے بحث کر رہے تھے۔ بحث ہی کے دوران ان کے نام ایک تار آیا۔ انھوں نے تار لیا، اطمینان سے پڑھا اور جیب میں رکھ لیا۔ بحث اسی طرح چلتی رہی۔ پھر عدالت کا وقت ختم ہوا۔ عدالت اُٹھ گئی۔ کسی ساتھی نے ہمارے وکیل صاحب سے پوچھا " وہ تار کیا تھا؟" وکیل صاحب نے جواب " بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، اسی کی خبر تھی۔"

جس نے بھی سُنا، پاگلوں کی طرح دیکھتا رہ گیا۔ ایک دوست نے ہمّت کرکے پوچھا: "بیوی کی موت کی خبر پاکر بھی تم بحث کرتے رہے۔"

وکیل صاحب بولے: "اور کیا کرتا؟ وہ تو چلی ہی گئی تھی۔ مؤکل کو بھی چلے جانے دیتا؟"

اس وقت وکیل صاحب کی عمر صرف 33 سال کی تھی مگر اس کے بعد انھوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔

ایک اور منظر:

جولائی 1927 ۔ طوفان اور سیلاب! سات دنوں سے پانی میں ڈوبا احمد آباد سیلاب کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔ میونسپل کمیٹی کے صدر صاحب کا بھی دل گھبرا اُٹھا۔ ہمارے وکیل صاحب ہی تو صدر ہیں۔ وہ رات کے بارہ بجے اسی طوفانِ بادو باراں میں اکیلے نکل پڑتے ہیں۔ راستے میں اپنے ہی جیسے ایک باہمّت دوست کو ساتھ لیتے ہیں اور صبح ہونے تک سارے شہر کا چکّر لگا لیتے ہیں۔ پھر پہونچتے ہیں انجنیئر کے گھر۔ وہ اس طوفان میں انھیں دیکھ کر چونک پڑتا ہے۔ انجنیئر کو ساتھ لے کر وہ پھر نکل پڑتے ہیں۔

چار دن اور چار راتیں۔ سیلاب اسی طرح تھپیڑیں مارتا رہتا ہے اور وہ بہتے پانی کے لیے راہ بناتے رہتے ہیں۔ انھیں کام کرتے دیکھ کر مزدور بھی اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اگر اس وقت پانی نہ نکلا ہوتا تو کسے معلوم احمد آباد کی کیا حالت ہوتی۔

آپ سمجھ تو گئے ہی ہوں گے کہ یہ تصویریں کس کی زندگی کی ہیں؟ اس شخص کو آج ہم مردِ آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل کے نام سے جانتے ہیں۔ جدید ہندوستان کے صفِ اوّل کے معماروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک وقت تو یہ "سردار" لفظ ہی بغاوت اور فتح کی علامت بن گیا تھا کیونکہ ان کے مقصدِ زندگی کو ظاہر کرنے والے الفاظ تھے:

شور سنگرام کو دیکھ بھاگے نہیں
دیکھ بھاگے سو شور نہیں[1]

گٹھا ہوا جسم، آہنی لکیروں سے بھرا چہرہ، عزم کی علامت جبڑے، دشمن کو للکارتی اور دوست

---

[1] بہادر وہ ہے جو لڑائی کو دیکھ کر نہ بھاگے، اور جو بھاگ جائے وہ بہادر نہیں ہوتا۔

کو بے خوفی اور قوت عطا کرتی ہوئیں تیز چمکتی آنکھیں! یہ تصویر تھی باوقار گجرات کے پر وقار سردار کی۔
انھوں نے ابھیمنیو کی طرح فرض کے راستے پر ڈٹے رہنا سیکھا تھا اور ان کے لیے ڈٹے رہنے کا مطلب تھا: جیت! وہ آتش فشاں کی طرح جلا کر راکھ کر دینے کی قوت رکھتے تھے، مگر اس کی دھما کہ خیزی ان میں نہیں تھی۔ وہ بہت کم بولتے تھے، کیونکہ مہاتما لوتھر کے لفظوں میں: "سچے سپاہی اور سردار کبھی بڑھ چڑھ کر باتیں نہیں کرتے۔ لیکن جب بولتے ہیں تو بس ختم ہی سمجھیے۔"

وراثت

ایسے سردار کا جنم بھی اسی سرزمین پر ہوا تھا جو گیتا کے گایک واسو دیو کرشن کا میدانِ عمل رہی ہے اور جس نے مہارشی سوامی دیانند سرسوتی، راشٹرپتا مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی، محب وطن وٹھل بھائی پٹیل جیسے بہادروں کو جنم دیا تھا۔ اس علاقے میں چروتر ریاست کے وسط میں آنند نام کا ایک تعلقہ ہے۔ اسی تعلقے میں ایک گاؤں ہے، کرم سد۔ اس گاؤں میں زیادہ تر پٹی داروں کی آبادی ہے۔ ان ہی پٹی داروں کے ایک خاندان میں ولبھ بھائی پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام جھویر بھائی پٹیل تھا۔ وہ سوامی نرائن مسلک کے ماننے والوں میں سے تھے۔ کھیتی بھی کرتے تھے اور بھکتی بھی۔ جتنی بھکتی بھگوان کی کرتے تھے اتنی ہی دیش کے لیے بھی تھی۔

1857 میں جب پہلی بار منظم طور سے ہندوستان میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوئی، تو کہا جاتا ہے کہ جھویر بھائی نے بھی اس میں حصّہ لیا تھا۔ باغیوں کی مدد کرنے کی غرض سے وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اپنا کام انجام دیتے ہوئے اندور میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہیں انھیں قید میں بھی رکھا گیا تھا۔ اندور کے راجا نے اس بغاوت میں حصّہ نہیں لیا تھا، لیکن پھر بھی باغیوں کے لیے ان کے دل میں بڑی ہمدردی تھی اس لیے جھویر بھائی پر بھی انھوں نے کوئی سختی نہیں کی۔

اندور کے یہ راجا شطرنج کے اچھے کھلاڑی تھے۔ ایک دن وہ اپنے کسی درباری کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس دن ان کا کھیل جم نہیں رہا تھا۔ وہ غلطی پر غلطی کرتے چلے جا رہے تھے۔ اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ کچھ دور پر کھڑے قیدی جھویر بھائی اس کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ مہاراج غلط چال چلنے والے ہیں، ان سے رہا نہ گیا۔ بڑے احترام کے ساتھ وہ بولے، "راجا صاحب مہرے کو وہاں نہیں بلکہ اُس خانے میں رکھیے۔"

مہاراج چونکے۔ واقعی وہ ایک بھیانک غلطی کرنے جارہے تھے۔ انھیں صحیح راستہ سمجھ میں آگیا۔ مگر انھیں ٹوکنے والا کون ہے ؟ اُنھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے جھویر بھائی قیدی کی شکل میں کھڑے تھے۔

اُنھوں نے اس قیدی سے متعلق مکمّل واقفیت چاہی۔ اس کے لیے ان کے دل میں احترام کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ جب انھیں قیدی کے بارے میں پوری واقفیت حاصل ہوگئی تو انھوں نے جھویر بھائی کو قید سے باعزّت رہا کردیا۔

تو ایسے دیش بھکت اور بے خوف باپ کے گھر 31 اکتوبر 1875 کو ولبھ بھائی کا جنم ہوا۔ ان کی ماں اس وقت اپنے باپ کے ہاں نڈیاڈ میں تھیں۔ ان کے نانا کی اقتصادی حالت ان کے والد کے مقابلے میں اچھی تھی۔ ان کی ماں لاڈ بائی گھر کے کاموں میں بہت سلیقہ مند اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ غریب ہونے کے باوجود بھی مہمانوں کی خوب آؤ بھگت کرتی تھیں۔ خدمت اور محبّت کی تو وہ مجسّمہ تھیں۔ گاندھی جی نے جب چرخہ چلانے پر زور دیا تو وہ گھر کے کاموں سے فرصت پاتے ہی سوت کاتنے بیٹھ جاتی تھیں۔

وہ جھویر بھائی کی دوسری بیوی تھیں اور ان کے ہاں پانچ بیٹے اور ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان میں تیسرے اور چوتھے بیٹے وٹھل بھائی پٹیل اور ولبھ بھائی پٹیل ہندستان کی تاریخ میں امر ہوگئے ہیں۔

ہمارے سردار کی زندگی پر ان کے والدین کی مذہبی عقیدت، ایثار اور باضابطہ زندگی کا زبردست اثر پڑا تھا۔ ڈرنا تو اُنھوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ قوّت برداشت اتنی تھی کہ دیکھنے والا دانتوں تلے اُنگلی دبالے۔ اپنے بغل کے پھوڑے کو انھوں نے جلتے ہوئے لوہے سے اپنے ہاتھوں سے کس طرح داغ دیا تھا، یہ کہانی تو پڑھ ہی چکے ہو۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب وہ بیرسٹر بننے انگلستان گئے تھے۔ وہاں ایک بار وہ بخار میں مبتلا ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ پیر میں درد بھی تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر بتایا: "نہروا نِکلا ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا۔"

اور آپریشن کیا گیا۔ ایک بار دوبار، لیکن نہروا نہیں نِکلا۔ سرجن نے کہا "پیر کاٹنا ہوگا۔"

ولبھ بھائی لنگڑا بننا کیسے منظور کرتے۔ انھوں نے دوسرے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے بتایا "ایک بار اور آپریشن کرنا ہوگا۔ اگر بے ہوشی کی دوا نہ سونگھو تو اچھے ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔"

ولبھ بھائی بولے: "مجھے بے ہوشی کی دوا سونگھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیسی بھی تکلیف ہو، میں برداشت کرسکتا ہوں۔"

اور آپریشن پورا ہونے تک انھوں نے اُف بھی نہ کی۔ ڈاکٹر اور ان کے ساتھی حیرت زدہ رہ گئے، اور بولے: "ایسا مریض آج سے پہلے ہمیں کبھی نہیں ملا۔"

کوئی انتہا نہیں ان کہانیوں کی۔ خوف تو جیسے انھیں چھو کر بھی نہیں گذرا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ وکیل بن چکے تھے۔ گودھرا میں ایک بار طاعون کی وبا پھیلی۔ عدالت کے ناظر کا لڑکا بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ سردار نے اس کی تیمار داری میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر وہ اسے بچا نہ سکے۔ اور تو اور وہ خود بھی طاعون کے شکار ہو گئے۔ ان کی بغل میں پھوڑا نکل آیا۔ طاعون کا بخار بڑے بڑے بہادروں کو بھی شکست دے دیتا ہے لیکن ہمارے سردار اسی حالت میں اپنی بیوی کو لے کر آنند پہونچے۔ وہاں پہونچ کر اُنھوں نے بیوی سے کہا۔ "تم کرم سد جاؤ، میں نڈیاڈ جاتا ہوں۔ گھبرانا نہیں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

شوہر طاعون جیسے مرض میں مبتلا ہے اور بیوی سے الگ ہونے کو کہا جائے تو اس سے زیادہ غمناک صورت حال اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن سردار کی بیوی کو "سردار کی بیوی" بننا تھا، اسے الگ جانا پڑا۔

تعلیم کے لیے ولبھ بھائی کو کرم سد، پیٹ لاد، نڈیاڈ، بڑودا، نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی۔ لیکن جہاں کہیں بھی گئے، سردار بن کر ہی رہے۔ نڈیاڈ میں ان کے نانا کا گھر تھا۔ وہ گجرات کے عالموں کی سرزمین مانی جاتی ہے۔ وہیں کے ہائی اسکول میں وہ داخل ہو گئے۔ لیکن یہ جان کر کہ بڑودا میں انگریزی کی تعلیم اور بھی اچھی ملے گی، وہ وہاں کے ہائی اسکول میں چلے گئے۔ یہاں گجراتی کے اُستاد تھے شری چھوٹا لال۔ وہ پڑھاتے تو گجراتی تھے، مگر سنسکرت کے بڑے عاشق تھے۔ کوئی طالب سنسکرت چھوڑ کر گجراتی کے کلاس میں آجاتا تو وہ بڑے دکھی ہوتے۔ ہمارے ولبھ بھائی نے بھی ایسا ہی کیا تو، اس وقت چھوٹا بھائی نے ان کا استقبال کرتے ہوئے مذاق میں کہا۔ "تشریف لائیے جناب! آپ نے سنسکرت چھوڑ کر گجراتی زبان تو لے لی ہے، لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ جس کی سنسکرت اچھی نہیں ہوتی، اس کی گجراتی بھی اچھی نہیں ہوتی ہے۔"

ان کے کہنے کا ڈھنگ کچھ ایسا تھا کہ ولبھ بھائی نے اسے اپنی بے عزّتی سمجھا۔ وہ بولے۔ "صاحب سبھی طالب علم اگر سنسکرت لے لیں تو آپ کی کلاس میں کوئی نہیں آئے گا اور پھر آپ کو گھر بیٹھنا پڑے گا۔"

چھوٹا لال جی ایسے کھرے جواب کے عادی نہیں تھے۔ اُنھوں نے ولبّھ بھائی کو میز پر کھڑا ہو جانے کا حکم دیا اور ایک سے دس تک پہاڑے لکھ کر لانے کو کہا۔

ولبھ بھائی نے اسے بھی اپنی بے عزتی سمجھا۔ اُنھوں نے پہاڑے نہیں لکھے۔ ماسٹر صاحب نے سزا اور بھی بڑھا دی۔ ولبھ بھائی نے ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اب تو دونوں نے ضد پکڑ لی۔ سزا بڑھتے بڑھتے دو سو پہاڑے لکھنے تک پہونچ گئی۔ دوسرے دن ماسٹر جی نے پوچھا، "کیوں مہاشے آپ دو سو پہاڑے[1] لائے یا نہیں؟"

ولبھ بھائی نے جواب دیا "صاحب دو سو پاڑے لایا تو تھا لیکن ان میں سے دو مرکھنے تھے۔ یہاں پہونچتے ہی وہ طوفان مچانے لگے۔ پھر وہ تو بھاگے ہی، اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بھگا لے گئے۔ ایک بھی نہیں بچا۔"

بڑا انوکھا مذاق تھا۔ لیکن ماسٹر صاحب کے پاس اسے برداشت کرنے والا دل نہ تھا۔ غصّہ ہوکر بولے: "اگر تم کل پہاڑے لکھ کر نہیں لائے تو تمھارے خلاف مناسب کارروائی کی جائے گی۔"

دوسرے دن ولبھ بھائی نے کیا کیا کہ ایک پرچے پر لکھا: "دو سو پہاڑے"، اور وہ پرچہ ماسٹر صاحب کو دے دیا۔

جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ انھیں قصور وار طالب علم کی حیثیت سے ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت اپنی حفاظت کے طور پر ولبھ بھائی نے جو کچھ کیا تھا وہ قطعی ان کے کردار کی انفرادیت کے مطابق تھا۔ وہ بولے: "صاحب! ماسٹر صاحب نے میرے روکھے جواب کی وجہ سے مجھے میز پر کھڑا ہونے کی سزا دی۔ وہ میں نے مان لی۔ بعد میں پہاڑے لکھنے کو کہا، وہ ناانصافی تھی۔ میں چھٹے درجے کا طالب علم ہوں۔ مجھے چھوٹے درجے میں پڑھنے والے چھ سات سال کے لڑکوں کو دی جانے والی سزا دی جائے — پہاڑے لکھنے کو کہا جائے، یہ میری بے عزتی ہے۔ میری کتاب میں سے کچھ لکھنے کو کہا جاتا تو میرا کچھ فائدہ بھی ہوتا۔ اس لیے میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ اس کا جو بھی نتیجہ نکلے، میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

سب کچھ سمجھ کر ہیڈ ماسٹر نے فیصلہ دیا کہ طالب علم بے قصور ہے۔ اس طرح ستیہ گرہ کا پہلا سبق انھوں نے اپنی طالب علمی کی زندگی میں ہی پڑھا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ ڈسٹرکٹ پلیڈر کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ غربت کی وجہ سے نئی کتابیں نہیں خرید پاتے تھے بلکہ پرانی کتابیں عاریتاً لے آتے تھے۔ پھر بھی پہلی ہی کوشش

---

[1] گجراتی میں پاڑے لفظ کے دو معنی ہیں: (الف) پہاڑے (ب) بھینس کے نر بچے۔

میں وہ یہ امتحان پاس کر گئے وہ حوصلہ مند تھے اور ولایت جاکر بیرسٹر بننا چاہتے تھے، پر اتنا پیسہ کہاں سے لاتے۔ اس لیے اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ وکالت کریں گے اور پیسہ جمع کرنے کے بعد ولایت جائیں گے۔

وکیل صاحبؑ

ولبھ بھائی وکیل بنے اور بہت جلد ان کی وکالت کی دھاک [illegible]
[illegible] بھی طاق تھے۔ اپنے مؤکلوں کی کامیابی کے
لیے وہ کس حد تک آگے جا سکتے تھے اس کی مثال دی جا چکی ہے۔ اس لیے بھی وہ بہت مقبول تھے۔

ایک بار محکمۂ آبکاری کے انسپکٹر نے غیر قانونی طور پر شراب کشید کرنے والے ایک شخص کو گرفتار کیا۔ ساتھ میں شراب سے بھری دو بوتلیں بھی تھیں۔ وہ بوتلیں مجسٹریٹ کے قریب رکھ دی گئیں۔

اس شخص نے ولبھ بھائی کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ مقدمہ شروع ہوا۔ جرح ہوئی۔ شراب کی بوتلیں بھی بطورِ ثبوت پیش کی گئیں۔ ولبھ بھائی نے انھیں دیکھا اور کہا: "ان بوتلوں کے اندر کیا ہے۔ ڈاکٹر اس کی جانچ کرے۔"

پتا لگا اس میں شراب نہیں خالص پانی بھرا تھا۔ اب تو انسپکٹر صاحب بہت گھبرائے، لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے ولبھ بھائی مقدمہ جیت گئے۔ باہر آکر انسپکٹر نے ولبھ بھائی سے پوچھا: "وکیل صاحب! آخر یہ ہوا کیا؟ بوتلوں کے اندر شراب تھی، آخر وہ گئی کہاں؟"

ولبھ بھائی ہنسے اور کہا: "آپ نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں۔ مجسٹریٹ شرابی ہے، آپ کی شراب وہ پی گیا اور بوتلوں میں پانی بھروا دیا۔"

اِن دنوں ایک ڈاکو تھا۔ نام تھا اس کا گلاب راجہ۔ وہ خاندانی ڈاکو نہیں تھا۔ غلط سماجی نظام کی وجہ سے نہ جانے کتنے سیدھے سچّے لوگ ڈاکو بن جاتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ڈاکو بن گیا تھا۔

بہت تیز مزاج تھا اور اس نے بڑے فساد مچا رکھے تھے۔ اُڑتے اُڑتے اس کی کہانی کلکٹر مسٹر وُڈ تک پہونچی۔ اُنھوں نے حکم دیا کہ گلاب راجہ کو گرفتار کرکے ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ اتفاق کی بات اس وقت گلاب راجہ وہیں موجود تھا۔ اس نے کلکٹر سے کہا، "صاحب میں ہی گلاب راجہ ہوں۔ جرم کرکے آپ کے سامنے آؤں تو آپ مجھے سزا دیں۔ اس وقت تو میں بے قصور ہوں سو آپ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے ایسا غائب ہوا جیسے تھا ہی نہیں۔ مسٹر وُڈ نے اسے اپنی بے عزّتی سمجھا۔ اُنھوں نے ایک شخص سے جھوٹی شکایت کروادی کہ گلاب راجہ نے اس پر حملہ کیا اور اینٹ ماری ہے۔ کلکٹر کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسے نو ماہ کی سزا بھی سُنادی گئی۔

اب تو گلاب راجہ واقعی باغی بن گیا۔ اس نے باضابطہ ڈاکے ڈالنے شروع کردیے۔ ایسی لوٹ مار مچائی کہ پولس کی ناک میں دم آگیا۔ گلاب [illegible] سے ولبھ بھائی کے پاس آتا تھا۔ پولس کے کپتان نے ولبھ بھائی سے کہلا بھیجا کہ "وہ سرکار کا مجرم ہے، اب آپ کے پاس آئے تو مجھے اطلاع دیں۔"

ولبھ بھائی تو ولبھ بھائی ہی تھے۔ جواب میں کہلا بھیجا۔ "وہ میرے پاس آتا ہے تو کسی اعتماد کی وجہ سے ہی آتا ہے۔ میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔"

پولس افسر نے پھر کہا۔ "آپ یہ کام کردیں تو پولس پراز یکیوٹر کے عہدے پر آپ کی تقرری ہوسکتی ہے۔"

ولبھ بھائی غصّہ میں اُبل پڑے۔ "مجھے ایسے کالے کام کرکے پولس پراز یکیوٹر نہیں بننا ہے۔ ایسے کام کرنے والے کا مُنہ کالا ہو۔"

وکیلوں کے کمرے کا ایک دروازہ کمرۂ عدالت میں کُھلتا تھا۔ وکلاء حضرات اسی دروازے سے کمرۂ عدالت میں آتے جاتے تھے۔ ایک دن منصف صاحب نے وہ دروازہ بند کروادیا۔ انھوں نے کہا کہ، "بار بار آنے جانے سے کام میں خلل پڑتا ہے۔"

دروازہ بند ہوجانے سے وکیلوں کی آمد و رفت میں مشکل ہوگئی۔ آنے جانے میں دیر ہونے لگی۔ عدالت میں کب کس وکیل کی ضرورت ہوگی۔ یہ جاننا بھی مشکل ہوگیا۔ چنانچہ سارے وکیل منصف کے پاس گئے۔ انھیں اپنی مشکلات بتائیں اور دروازہ کھول دینے کی گذارش کی۔

لیکن منصف صاحب نہیں مانے۔ سردار اِن دنوں زیادہ تر فوجداری کے عدالت میں کام کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد اِدھر آئے تو انھیں اس واقعے کی اطلاع ملی۔ انھوں نے سارے وکیلوں کو جمع کیا، "منصف صاحب سے کہو کہ دروازہ کھول دیں، نہیں تو ہڑتال کر دیں گے۔"

بات منصف صاحب تک پہونچی۔ ایسے موقع پر وہ اچانک کیسے جھک جاتے۔ لیکن جب کھیڑا ضلع کے جج نے انھیں بُلا کر یہ کہا کہ اس معاملے کو جلد از جلد نپٹاؤ، تو وہ سچ مچ گھبرا اُٹھے۔ انھوں نے اپنے ایک جاننے والے وکیل کو بلا کر سمجھوتہ کرا دینے کی بات کہی۔

وہ وکیل صاحب سردار کے پاس آئے، اور بولے: "منصف صاحب نے آپ کو بنگلے پر بلایا ہے۔"

سردار نے جواب میں کہا: "میں نہیں جاؤں گا۔ جسے غرض ہو وہ میرے پاس آئے۔" منصف بھی منصف تھے۔ وکیل کے پاس خود جانے میں ان کی بے عزتی تھی مگر سمجھوتہ کرنا بھی ضروری تھا۔ انھوں نے کہا: "ان سے کہو کہ وہ اور دوسرے وکیل میرے ساتھ چائے پئیں۔ میں سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔"

سردار نے شرط رکھی، "آ سکتے ہیں، مگر انھیں اپنے کیے پر اظہارِ افسوس کرنا ہوگا۔" بیچارہ منصف! اس نے بھلا ایسے وکیل کہاں دیکھے تھے۔ بالآخر اسے جُھکنا پڑا۔ اس نے معافی مانگی۔ سب کو چائے پلائی اور دروازہ کھول دیا۔

لیکن وہ واقعہ جس سے ان کی انوکھی سوجھ بوجھ کا پتا چلتا ہے، سچ مچ انوکھا ہی ہے! سردار کے ایک رشتہ دار بھائی ریلوے پولس میں تھانے دار تھے۔ ان صاحب کی اپنے افسر سے نہیں پٹتی تھی۔ اور افسر تھے ایک انگریز جس کا بھائی حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ موقع پاکر ایک دن اس افسر نے تھانے دار کو پھانس لیا۔ ان پر ایک روپے کی لکڑی کی چوری کا الزام عاید کیا۔ ان دنوں ریلوے میں چوری ڈاکے بہت ہی عام تھے۔ اس لیے یہ چھوٹا سے معاملہ بھی بڑی آسانی سے ایک بڑا معاملہ بن گیا۔ اس کی تحقیقات کے لیے ایک خصوصی عدالت قائم ہوئی۔ پیروی کے لیے احمد آباد سے سرکاری وکیل آئے۔ عدالت میں جانے سے قبل ساری تحقیقات بذاتِ خود اس افسر نے کی۔ وہ ایک بات خاص طور سے جاننا چاہتا تھا۔ آیا تھانے دار کو اس سے پہلے کبھی سزا ہوئی تھی یا نہیں؟

تھانے دار نے سارا معاملہ سردار پٹیل کو سونپ دیا۔ ان کی صلاح سے تھانے دار خود ہی انگریز افسر کے پاس گیا اور کہا۔ "مجھے پہلے بھی سزا ہو چکی ہے۔"

افسر کو حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔ پوچھا: "کتنی سزا ہوئی تھی؟
"نو ماہ کی۔ بالکل تنہائی میں رکھا گیا تھا۔"
"ہوں! کب کی بات ہے؟"
"بہت پرانی، کوئی تیس سال کا عرصہ ہوا ہوگا۔"

افسر تو بس یہی چاہتا تھا۔ اس نے ساری باتیں لکھ لیں اور مقدمہ عدالت کے سپرد کر دیا۔ جب یہ معاملہ عدالت میں پیش ہوا تو سردار یکایک بیمار ہو گئے۔ ان کی جگہ سردار کے بڑے بھائی وٹھل بھائی پٹیل پیروی کرنے لگے۔ وہ تھے جھگڑالو۔ چنانچہ سرکاری وکیل سے لڑ پڑے۔ اس کا نتیجہ خراب نکلا، یعنی تھانے دار کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔

سردار نے سُنا تو گھبرائے نہیں۔ اُنھوں نے عدالتِ عالیہ میں اپیل کرائی۔ ادھر تھانے دار کو ضمانت پر رہا کرانے کی کوشش کی۔ ایک بڑے بیرسٹر کو پیروی کی غرض سے بُلایا گیا۔ حکومت نے اس بات کی سختی سے ممانعت کی لیکن عرضی منظور ہو گئی۔ تب سردار نے اپیل کی سنوائی فوراً کرنے کا مطالبہ کیا۔

بالآخر اپیل کی پیشی ہوئی۔ سرکاری وکیل وہاں بہت ہی گرجے برسے، کہا "ایسے معاملے بہت ہی مشکل سے گرفت میں آتے ہیں۔ پھر ملزم پولس افسر ہے۔ یہ کتنی خطرناک بات ہے کہ باڑ ہی کھیت کو کھا رہی ہے۔"

وکیل صفائی بولے: "پہلے الزام ثابت کیجئے، تب سوچیے کہ ملزم کون ہے؟ اس پہلے اس بات پر غور ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

سرکاری وکیل نے کہا۔ "ملزم کو پہلے بھی سزا ہو چکی ہے۔ اس بات پر بھی غور کریں۔"
یہ سُن کر وکیل صفائی ٹکو بنے دیکھتے رہے۔ جج نے ان سے اس بات کا جواب مانگا۔ مگر وہ کیا کہتے۔ سردار پر بگڑ پڑے۔ بولے۔ "مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں کبھی بھی اپیل کرنے کی صلاح نہ دیتا۔"

وہ مقدمہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک عجیب سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سردار کی وجہ سے لوگوں کو کافی دلچسپی تھی۔ سب ہی سوچ رہے تھے۔ دیکھیں آگے کیا ہونا ہے۔ بچنے کی تو کوئی راہ بظاہر سامنے تو نہیں تھی۔ اب سردار اُٹھے۔ اُنھوں نے عدالت سے کہا، "ملزم کو پہلے سزا ہونے کا ثبوت دلایا جائے۔"

جج نے بات مان لی۔ اس پر سرکاری وکیل غصّے سے اُبل پڑے۔ بولے، "ملزم نے سب کچھ خود ہی قبول کیا ہے۔ اب آپ اور کیا ثبوت چاہتے ہیں؟" سردار نے کوئی جواب نہیں دیا خاموشی سے وہ بیان پڑھ لیا۔ جب بیان پڑھ چکے تو بولے۔ "صاحب اس میں لکھا ہے کہ ملزم کو نو ماہ کی سزا ہوئی تھی۔"

سرکاری وکیل نے کہا۔ "جی ہاں۔"

"اسے بالکل تنہائی میں رکھا گیا تھا۔"

"بیشک! اس کا جرم نہایت ہی سنگین رہا ہوگا۔"

"ملزم کو یہ سزا تیس سال قبل ہوئی تھی۔"

"جی ہاں، سب لکھا تو ہے۔" سرکاری وکیل نے بے تابی سے کہا۔

"جی ہاں میں لکھا ہوا ہی پڑھ رہا ہوں۔" سردار بولے: "اس میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ملزم کی عمر اب تیس سال کی ہے۔"

سردار کی بات سُن کر سب ہی چونک پڑے۔ تیس سال کے آدمی کو تیس سال قبل نو ماہ کی سزا! اور وہ بھی قید تنہائی!

اب سمجھنے کو کچھ باقی نہ بچا تھا۔ پوری عدالت ہنسی سے گونج اٹھی۔ سرکاری وکیل پیلے پڑ گئے۔ پھر سردار نے جو بحث کی وہ یقیناً شاندار تھی۔ انگریز افسر کتنا چالاک تھا نیز سرکاری وکیل کی دلیلیں کتنی تیز تھیں، سردار نے ان سبھی کی پول کھول دی۔

مقدمہ کمزور پڑ گیا۔ جج نے تھانے دار کو بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا۔ ہاں، انگریز افسر کی خاصی کھنچائی کی۔ بیچارے کو آخر کار نوکری سے دست بردار ہونا پڑا۔

ان کی بڑی خواہش تھی کہ ولایت جاکر بیرسٹر بنیں۔ اسی غرض سے پیسے جمع کر رہے تھے۔ اِن ہی کے لفظوں میں، "اس کے بعد میں نے قانون کا مطالعہ کیا اور وکالت کا پیشہ اختیار کر کے ولایت جانے کے لیے رقم جمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جس کمپنی کے ذریعے ولایت جانے کے سلسلے میں خط و کتابت کی، اس کمپنی کا ایک تار جو میرے نام آیا تھا، میرے بڑے بھائی کے ہاتھ لگ گیا۔ کیونکہ انگریزی میں ہم دونوں ہی وی۔ جے پٹیل کہے جاتے ہیں۔ جواب پڑھ کر بڑے بھائی نے کہا: "میں تم سے بڑا ہوں۔ مجھے ولایت جانے دو۔ میرے لوٹنے کے بعد تمھیں جانے کا موقع ملے گا لیکن

تمھارے لوٹنے کے بعد میں ولایت نہیں جاسکوں گا۔" میں نے بھائی کو پندرہ دن کا وقت دیا۔ پندرھویں دن وہ ولایت کے لیے روانہ ہو گئے۔ تین سال میں وہ لوٹ آئے۔ اس کے بعد میں ولایت گیا۔"

ولایت جاکر سردار راگ رنگ میں نہیں ڈوبے۔ جس کام کی غرض سے وہاں گئے تھے اسی کام میں محو رہے۔ ان کی رہایش گاہ سے مڈل ٹمپل گیارہ میل کی دوری پر تھا۔ سویرے ناشتے سے فارغ ہوکر لائبریری کھلنے کے وقت تک وہ پیدل چل کر وہاں پہونچ جاتے اور وہاں سارا دن قانون کی کتابیں پڑھتے رہتے۔ دوپہر کو دودھ اور ڈبل روٹی منگا کر کھا لیتے اور شام کو جب لائبریری بند کرنے والا چپراسی آکر ان سے کہتا کہ صاحب لائبریری بند ہونے کا وقت ہو گیا، تو تب ہی وہ وہاں سے اُٹھتے اسی بے پناہ مطالعے کے سبب وہ فرسٹ ڈویژن میں پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس ہوئے۔ انھیں پچاس پونڈ کا انعام اور دو ٹرم کی چھٹی ملی۔ ان کے لکھے ہوئے جوابات اتنے اچھے تھے کہ چیف ایکزامنر نے بمبئی کے چیف جسٹس کو لکھا:

"ولبھ بھائی پٹیل ایک اچھے جج ہو سکتے ہیں۔ اس لیے محکمۂ انصاف میں کسی اعلیٰ عہدے پر ان کی تقرری ہونی چاہیے۔"

چونکہ انھیں جج نہیں بننا تھا اس لیے انھوں نے اس سفارش سے کوئی فایدہ نہیں اٹھایا۔ احمد آباد آکر بیرسٹری کرنے لگے اور بہت جلد یہاں بھی ان کی دھاک جم گئی۔

اپنے بڑے بھائی سے اُنھوں نے ایک سمجھوتہ کیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: "ہندستان کو آزاد کرانا ہو تو کسی نہ کسی کو تو سماج سیوا میں لگنا ہی چاہیے۔ ہم دونوں بھائیوں نے کام کا بٹوارہ کر لیا ہے۔ وٹھل بھائی دیش کی سیوا کریں۔ میں پیسے کماؤں۔ وہ ثواب کمائیں اور میں گناہ۔ مگر وہ جو کام کریں گے اس میں میرا حصّہ تو رہے گا ہی۔"

اس وقت کیا وہ جانتے تھے کہ بہت جلد ہی وہ بھی گناہ کمانا چھوڑ کر 'ثواب کمانے' کے کام میں لگ جائیں گے۔

کرم سد (گجرات) کا گھر، یہاں ولبھ بھائی پٹیل کا بچپن گذرا



طالب علم ولبھ بھائی، نڈیاڈ (گجرات)



بیرسٹر وٹھل بھائی اور بیرسٹر ولبھ بھائی (دائیں) - 1913 میں ولبھ بھائی کے انگلینڈ سے لوٹنے پر

ماں اور بھائیوں کے ساتھ ولبھ بھائی، (دائیں)

S.N. 21367 485

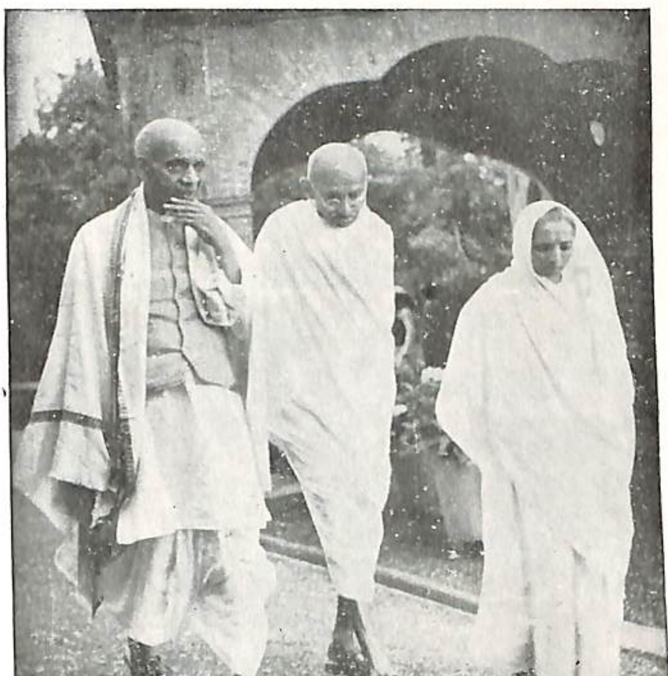
Superintendent,
Yeravda Central P[illegible]on.
(Poona).

سردار نے 29 مئی 1933 کو برت ختم کرنے پر گاندھی جی کو یہ خط لکھا :-

" اس شبھ گھڑی میں ہم دونوں (ولبھ بھائی اور چھگن لال جوشی) آپ کا آشیرواد چاہتے ہیں۔ آپ پر تو بھگوان مہربان ہیں، اور میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ ہم پر کرم فرما رہیں۔"

ہری پورہ کانگرس میں ۔ فروری 1938

جولائی 1945 کے شملہ اجلاس میں پٹیل، گاندھی اور منی بہن



ہندستانی آئین پر دستخط کرتے ہوئے۔ 24 جنوری 1950



ٹھکر باباکے ساتھ

۱ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولانا آزاد کے ساتھ

کنیا کماری مندر میں ۔ مئی 1950



ہندستانی بحری جہاز "دلی" پر۔ 18 مئی 1950



42 - "کام بلاشبہ عبادت ہے لیکن ہنسنا مسکرانا ہی زندگی ہے۔" سردار پٹیل

رام کرشن کے وویکانند

گاندھی جی سن 1915 میں جنوبی افریقہ سے لوٹے اور احمد آباد کے کوچرب نامی مقام پر آشرم بناکر رہنے لگے، ولبھ شروع شروع میں ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کوئی ان کے پاس جاتا تو [illegible] کرنے سے کیا ملک آزاد ہونے والا ہے؟"

لیکن گاندھی جی اتنا قریب آچکے تھے کہ ان سے زیادہ دن تک الگ رہنا مشکل تھا۔ انھوں نے جب گجرات سبھا کی رکنیت کے لیے اس مطلب کی ایک شرط رکھی کہ، "وہ عوام کو صاحبِ اقتدار لوگوں سے بھیک مانگنے کی صلاح نہ دیں بلکہ اس طرح کی تعلیم دیں کہ ان میں حکومت سے اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کی قوت پیدا ہو۔" تو ولبھ بھائی کے دل میں ایک جوش بھری بے چینی پیدا ہوئی۔ یہ کیسا شخص ہے جو بھیک مانگنے سے انکار کرتا ہے اور رعایا کو اپنے حقوق کی باریابی کے لیے قوّت حاصل کرنے کو کہتا ہے۔

نومبر 1917 میں گودھرا میں گجرات راج نیتک پریشد کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں بیگاری سے متعلق ایک تجویز پاس ہوئی۔ یہ رواج انھیں بہت کھٹکتا تھا۔ اس رواج کی وجہ سے غریب لوگوں کو جیسی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس کا انھیں بخوبی علم تھا۔ اس لیے اس رواج کے خاتمے کا کام انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہیں سے ان کی عوامی زندگی کی شروعات ہوئی ہے۔

اسی زمانے میں بارش کی زیادتی کی وجہ سے کھیڑا ضلع میں فصل بہت ہی کم ہوئی تھی یعنی روپے میں چار آنے بھی نہیں۔ ایسی حالت میں حکومت لگان نہیں وصول کرسکتی تھی مگر اس نے جھوٹے اعداد و شمار تیار کرائے اور کہا کہ فصل چار آنے سے زیادہ ہوئی ہے اس لیے لگان کی

وصولی ملتوی نہیں ہوگی۔ کسان گاندھی جی کے پاس پہونچے۔ اُنھوں نے بذاتِ خود اس کی تحقیق کی۔ کسانوں کا مطالبہ صحیح تھا۔ اس تحقیقات میں ولبھ بھائی نے بہت کام کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ جب وہاں ستیہ گرہ شروع ہوئی تو آخر تک وہ گاندھی جی کے معاونِ خصوصی بنے رہے۔ اس ستیہ گرہ کے خاتمہ پر گاندھی جی نے ان کے لیے کہا تھا کہ "مجھے یہ مان لینا چاہیے کہ ولبھ بھائی سے جب میں پہلے پہل ملا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ یہ اکھڑ شخص کون ہوگا۔ لیکن جب ان کے قریب آیا تو محسوس ہوا کہ ولبھ بھائی تو میرے لیے ناگزیر ہیں۔"

پرم ہنس رام کرشن نے اپنے وویکانند کو پہچان لیا تھا۔ ولبھ بھائی نے وکالت سے پیسہ کمانے کا منصوبہ ترک کرکے ساری زندگی خدمتِ خلق میں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد جب 1919 میں رولٹ ایکٹ کو لے کر گاندھی جی نے ملک گیر پیمانے پر ستیہ گرہ شروع کی تو اُنھوں نے گھر بار سب کچھ تج دیا۔ احمد آباد میونسپل کمیٹی کے رُکن کی حیثیت سے اُنھوں نے بار بار [illegible] اور عوام [illegible] کی زندگی کی ایک ہی بہتری اور ان کے [illegible] اور [illegible] کے لیے متعدد سہولتیں فراہم کیں۔

بہت جلد ہی وہ گجرات میں گاندھی جی کے سب سے اہم شاگرد کی حیثیت سے جانے پہچانے جانے لگے۔ جب عدم تعاون کی تحریک میں انگریزی نظامِ تعلیم کے تحت چلنے والے اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کی بات عوام کے سامنے آئی تو گجرات کالج کے طالب علموں نے ایک جلسے میں ان سے پوچھا کہ "ہم کالج کی تعلیم کو چھوڑ کر اگر گجرات ودیاپیٹھ میں آجائیں تو وہاں ہمیں کیسی تعلیم ملے گی۔" ولبھ بھائی نے جواب دیا: "گجرات کالج میں تم نے جو کچھ پڑھا ہے، اگر گجرات ودیاپیٹھ اسے بھول جانے کی تعلیم دے تو وہ کافی ہوگی۔"

انگریزی تعلیم کے بائیکاٹ کی تحریک کے دوران ہی ناگپور میں جھنڈا تحریک کی شروعات ہو گئی۔ چند شہری قومی پرچم کے ساتھ سول لائنز سے گذر رہے تھے کہ پولس نے انھیں روک دیا۔ سیٹھ جمنالال بجاج اس بے عزّتی کو نہ برداشت کر سکے۔ یہ سراسر شہری آزادی کی بے عزّتی تھی، گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ جمنالال جی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس حکم کی مخالفت کریں گے چنانچہ وہ قومی پرچم لے کر سول لائنز گئے اور گرفتار ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد کانگرس نے سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کیا اور ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا۔ اس کے لیے ایک تجربہ کار رہنما کی ضرورت تھی۔ کانگرس نے ولبھ بھائی کو ہی اس ذمّے داری کے لیے منتخب کیا۔

اس وقت تک ملک میں سوراج پارٹی قائم ہو چکی تھی۔ گاندھی جی 'چوراچوری' حادثہ کے بعد تحریک واپس لے چکے تھے۔ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ ہندستان میں ستیہ گرہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، اس لیے اسمبلیوں میں جاکر ہی قانونی تحریک شروع کرنی چاہیے۔

لیکن ولبھ بھائی نے اپنا منصوبہ کچھ ایسے بہتر ڈھنگ تیار کیا کہ سبھی صوبوں کے لوگ پارٹی بناکر ستیہ گرہ میں حصہ لینے کی غرض سے ناگپور آنے لگے۔ سارا ملک جاگ اٹھا۔ سردار نے اس زمانے میں ایک بیان دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ قومی پرچم کے ساتھ جلوس نکالنے کا مقصد یونین جیک کی بے عزتی یا کسی کو نقصان پہونچانا نہیں ہے بلکہ یہ تو ہندستانی عوام کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا سوال ہے۔

اب حکومت کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔ اسے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ اس نے قومی پرچم کے ساتھ سول لائنز میں جلوس نکالنے اور ستیہ گرہی قیدیوں کو جیل سے رہا کرنے کی بات منظور کرلی۔

ناگپور جھنڈا ستیہ گرہ کے بعد بورسد تعلقے میں 'منڈ کر' تحریک کی قیادت بھی سردار ہی نے کی۔ ڈاکوؤں سے عوام کو محفوظ رکھنے کی غرض سے حکومت نے دوسرے صوبوں سے پولس کے چار سو جوان وہاں تعینات کیے تھے۔ ان پر جو خرچ آتا تھا وہ ٹیکس کی شکل میں عوام سے وصول کیا جاتا ہے۔ یہ مُنڈ ٹیکس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حکومت کا کہنا تھا کہ جنتا مجرموں کا ساتھ دیتی ہے، اس لیے خرچ اسے ہی دینا چاہیے۔

ڈاکو تو حکومت کے اصولوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ عوام ٹیکس کیوں دیں؟ اسی بات کو بنیاد بناکر لوگ ولبھ بھائی کے پاس پہونچے۔ تحقیقات کے بعد کئی اور بھی چونکا دینے والی باتوں کا پتا چلا۔ تب ایک جلسے میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ ٹیکس ناانصافی پر مبنی ہے۔ عوام کو اسے ادا نہیں کرنا چاہیے۔ حکومت روک تھام کے لیے جو کچھ کرتی ہے وہ خرچ اسے خود برداشت کرنا چاہیے۔

یہ ستیہ گرہ کی شروعات تھی۔ حکومت نے سخت سے سخت قدم اٹھائے۔ ضبطی کے احکامات جاری کیے لیکن سرکاری افسروں کے پہونچنے تک گاؤں میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ بازار رات کو لگتے تھے۔ ایسے پُرامن ستیہ گرہ کو دیکھ کر سرکار دو مہینے میں ہی پریشان ہو گئی۔ سردار عوام کو تو پُرامن اور سچے بنے رہنے کی تلقین تو کرتے ہی تھے، ڈاکوؤں سے بھی کہتے تھے کہ، "یہ تو ایک یگیہ کی شروعات ہے۔ یہ شدھی کا یگیہ ہے۔ کوئی اسے برے کاموں سے گندہ نہ کرے۔ انھیں چاہیے کہ وہ عوام کو ستانا اور پریشان کرنا چھوڑ دیں۔ انھیں خلوصِ دل کے ساتھ اس یگیہ میں ساتھ دینا چاہیے۔

اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو انھیں ستیہ گرہی گانو چھوڑ کر کہیں اور بھاگ جانا چاہیے۔"

اس کے بعد ڈاکو واقعی بورسد تعلقے کے کسی گانو میں نہیں دکھائی دیے۔ سردار نے حکومت پر بھی زوردار حملے کیے۔ انھوں نے کہا: "حکومت نے ایک نامی ڈاکو کو پکڑنے کے لیے دوسرے اتنے ہی نامی ڈاکو کی مدد لی اور اسے ضروری اسلحہ بندوق وغیرہ دے کر من مانے ڈھنگ سے لوٹ مار کرنے، رعایا کو ستانے اور خون خرابہ کرنے دیا۔ یہ کھلا الزام میں حکومت پر عائد کرتا ہوں۔ حکومت ہی ڈاکوؤں کو پیدا کرنے والی ہے۔ حکومت ہی ان کی رہنمائی کرنے والی ہے۔ اب وہی حکومت بے قصور رعایا سے جرمانے کے طور پر ٹیکس وصول کرنے کے لیے اس پر ظلم کرتی ہے۔ چوری کرنے والا چور، اپنے انصاف کرنے والے جج کو ہی سزا دے، یہ اس کی بہترین مثال ہے۔"

اب حکومت چونکی۔ اس نے تحقیقات کی غرض سے ہوم سیکریٹری کو روانہ کیا۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اور سُنا، اس سے عوام کے بے قصور ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس نے احکام جاری کر دیے کہ "منڈ ٹیکس رد کر دیا جائے نیز جو سامان ضبط کیا گیا ہے وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دیا جائے۔

1927 میں جب گجرات میں بھیانک باڑھ آئی تو اس وقت سردار احمد آباد میونسپلٹی اور صوبائی کانگرس دونوں کے ہی صدر تھے۔ اس وقت انھوں نے جس طرح کام کیا، اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن صرف اتنا ہی نہیں تھا بلکہ انھوں نے وہاں کی نازک صورت حال کی مکمل تفصیل اپنے بڑے بھائی وٹھل بھائی پٹیل کو بھی بھیج دی تھی جو اس زمانے میں مرکزی اسمبلی کے صدر تھے۔ اس تفصیل کو پڑھ کر وہ بہت ہی متاثر ہوئے اور انھوں نے وائسرائے لارڈ اروِن کو گجرات جا کر اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کی صلاح دی۔

وائسرائے گئے۔ سب کچھ دیکھا۔ ولبھ بھائی سے ملاقات کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ایک کروڑ کی رقم منہدم مکانات کی تعمیر نو کے لیے مل گئی۔ مخالف حکومت سے اتنی بڑی رقم لے لینا انہونی بات تھی۔

اس کام سے عوام کے حوصلے تو بڑھے ہی، گاندھی جی نے بھی جذبۂ خدمت کی اس فتح کو سچ اور عدم تشدد کی فتح مانا۔

باردولی کے سردار

ولبھ بھائی کی زندگی اب مکمّل طور پر عوامی زندگی بن چکی تھی۔ لیکن جس تحریک نے انھیں سردار بنایا وہ تحریک باردولی میں 1928 میں شروع ہوئی۔

عدم تعاون تحریک کے شروع کے دور میں گاندھی جی نے باردولی کو ہی مرکز بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن چوری چورا کے حادثے کے بعد انھیں اس فیصلہ کو بدلنا پڑا، پھر بھی حکومت کی نظر تو اس پر پڑ ہی چکی تھی۔ چنانچہ جب 1928 میں اس علاقے کا رویزن سیٹل منٹ ہوا تو اس کا لگان 22 فی صد بڑھا دیا گیا۔

عوام نے اس کی مخالفت کی۔ عوام کے نمایندوں پر مشتمل ایک وفد حکومت سے ملا لیکن کسی نے ان کی بات نہیں سُنی۔ حکومت کا جواب تھا کہ محکمۂ مالیات کے فیصلے میں کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی ہے۔

آخر کار وہ لوگ ولبھ بھائی کے پاس پہونچے۔ پوری چھان بین کرنے کے بعد سردار نے گاندھی جی سے کہا، "میں نے سارے معاملے کی تحقیقات کرلی ہے۔ مجھے تو لڑائی کی شروعات کرنی ہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔"

گاندھی جی کا جواب تھا، "تب تو مجھے دعا کرنی چاہیے کہ گجرات کی فتح ہو۔"

سردار دوسروں کا امتحان کیسے لیتے تھے۔ ایک بڑے لیڈر اور زمیندار سے انھوں نے پوچھا: "آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بولے: "چار آدمی بھی سچے ہوں گے تو سارا تعلقہ ان کے ساتھ ڈٹا رہے گا۔"

"ان میں آپ شامل ہیں؟"

"نہیں صاحب! میں تو ان چار کے پیچھے چلنے والا ہوں"۔

ولبھ بھائی بولے: "ایسے آدمی کھڑے ہو جائیں جو محصول میں اضافے کے خلاف لڑی جانے والی لڑائی میں مرنے کو تیار ہوں"۔

لمحہ بھر میں چار آدمی سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

پھر بھی سردار اپنی تقریروں میں بار بار کہتے تھے، "میرے ساتھ مذاق نہیں ہو سکتا۔ بغیر خطرے کے کام میں میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جو خطرہ مول لینے کو تیار ہوں، ان کے ساتھ کھڑا رہونگا۔ آپ کی ناکامی ہو گی تو سبھوں کا مستقبل بگڑے گا"۔

انھوں نے حکومت سے بھی بات چیت کی مگر بھلا وہ کیوں سننے والی تھی۔ بالآخر 12 فروری 1928 کو کسانوں کے ایک جلسے میں اتفاق رائے سے ستیہ گرہ شروع کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ "حکومت محصول میں اضافہ کی پھر سے تحقیقات کرانے کو تیار نہ ہو تو سرکار کو ایک پیسہ بھی نہ دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں حکومت ضبطی کرے، زمین چھین لے یا دوسرا جو بھی قدم اٹھائے تو ان سے ہونے والی ساری تکلیفیں برداشت کی جائیں"۔

ایک جانب طاقتور حکومت تھی اور دوسری جانب نہتے کسان۔ ان کا نظم وضبط، خلوص، عزم اور احترام کو دیکھ کر سردار کا دل بھی کھِل اُٹھا۔ 'ٹائمز آف انڈیا' نے تو یہ سب دیکھ کر یہاں تک لکھ دیا تھا کہ باردولی میں 'بولشوازم' تحریک چل رہی ہے اور ولبھ وہاں کے 'لینن' ہیں۔

حکومت نے عوام کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ حتیٰ کہ عورتوں کو بھی نہ چھوڑا۔ گھر بار لوٹے، آگ لگائی، اثاثے نیلام پر چڑھا دیے گئے مگر عوام کے قدم نہ ڈگمگائے۔ سردار کا طریقہ ہی کچھ ایسا تھا۔ حکومت کا جب کسی بھی طرح بس نہ چلا تو بوکھلا اٹھی۔ اس نے بھینسوں تک کو جیل میں ڈال دیا۔ عجیب وغریب احکامات جاری کیے گئے۔ ایک میں کہا گیا: "عام راستوں کے قریب یا گلیوں میں پبلک مقامات پر ڈھول وغیرہ بجانا جرم سمجھا جائے گا"۔

سردار نے ان احکامات کا خوب خوب مذاق اڑایا، بولے: "گولے بارود والی سرکار ڈھول تاشوں سے ڈر گئی۔ اب ڈھول بجانا بند کر دو۔ ایسے احکامات جاری کر کے حکومت ہمیں پھنسانا چاہتی ہے۔ ہمیں بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں ڈھول نگاڑوں سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمیں تو لوگوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ وہ لگان نہ دیں"۔

ایک دن سردار والوڈ کے جلسے میں یہی بات سمجھا رہے تھے۔ جلسہ تھانے کے سامنے ہو

رہا تھا۔ تھانے میں بھینسیں قید تھیں۔ سردار کی تقریر ختم ہوئی تو بھینسیں چلانے لگیں۔ سردار بول اُٹھے: "سنو! ان بھینسوں کی آواز رپورٹرو، رپورٹ کرو کہ والوڈ کے تھانے میں بھینسیں تقریریں کر رہی ہیں۔ ہمارے ڈھول تاشوں سے یہ حکومت اُلٹ رہی ہے۔ اب ان بھینسوں کی آواز سنو۔ یہ بھینسیں پکار پکار کہہ رہی ہیں کہ اس حکومت سے انصاف مُنہ چھپا کر بھاگ گیا ہے۔"

جیل کے اندھیرے میں رہتے رہتے بھینس کچھ سفید پڑ گئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر سردار نے کہا۔ "یہ تو میڈم ٹری بن گئی ہیں یعنی گوروں کی جیل میں رہتے رہتے کالی بھینسیں بھی گوری میم جیسی بن گئیں۔"

دن بہ دن عوام کی اخلاقی قوت بڑھ رہی تھی۔ حکومت پست ہو رہی تھی۔ وہ سمجھوتے کے لیے تیّار تھی۔ مگر وہ ہو کیسے۔ اسی زمانے میں شری کنہیا لال منشی باردولی آئے۔ انھوں نے سارے حالات کا جائزہ لیا اور اس کی ایک مؤثر رپورٹ حکومتِ بمبئی کو بھیجی:

"باردولی تعلقے میں 80000 مرد، عورتیں اور بچے اپنی منظم مخالفت کا مظاہرہ کرنے کا مکمّل عہد اور اس کی پیروی کرنے کے اٹل ارادے سے تیار کھڑے ہیں۔ ضبطی کرنے والے آپ کے افسروں کو وہاں نائی تک نہیں ملتا ہے۔ بال کٹوانے کے لیے ان بیچاروں کو میلوں تک بھٹکنا پڑتا ہے۔ آپ کے ایک افسر کی موٹر کیچڑ میں پھنس گئی تھی، اگر شری ولبھ بھائی وہاں موجود نہ ہوتے تو اس کی موٹر اسی کیچڑ میں ہی پھنسی رہتی۔ جس شخص کے ہاتھوں ہزاروں کی قیمت کی زمین نہایت قلیل رقم کے عوض فروخت کر دی گئی ہے، اس کے گھر میں صفائی کے لیے بھنگی تک نہیں ملتا۔ کلکٹر کو ریلوے اسٹیشن پر کوئی بھی سواری نہیں ملتی ہے۔ شری ولبھ بھائی کی اجازت سے ہی کوئی سواری اسے میسّر ہو سکتی ہے۔ میں جس گانو میں گیا تھا وہاں مجھے کوئی بھی مرد یا عورت ایسی نہیں ملا جسے اپنے فیصلے پر افسوس ہو اور وہ اپنے منتخب شدہ راستے پر چلنے میں اٹل نہ ہو۔ جب شری ولبھ بھائی ایک گانو سے دوسرے گانو جاتے تھے تو میں نے دیکھا کہ ہر ایک گاؤں کے مرد عورتیں اور بچّے بے انتہا خوشی سے ان کا استقبال کرنے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اَن پڑھ عورتیں ——— جوان اور بوڑھی، اپنے پھٹے پُرانے کپڑوں میں ہی آ کر ان کے ماتھے پر کُم کُم اور چندن لگاتی تھیں اور کڑی محنت کے بعد حاصل کیے ہوئے ایک یا دو روپے اپنے تعلقے میں لڑی جانے والی سچ کی لڑائی کے لیے، ان کے قدموں پر احترام اور بھکتی کے جذبے سے مخمور ہو کر نذر کرتی تھیں۔ نیز غیر ملکی حکومت کے ظلم کا پردہ فاش

کرنے والے' ڈگمگے ڈگمگے تاروانیائے چھے' (پگ پگ پر تیرا ظلم ہے) گیت بہت ہی مست ہو کر حوصلے سے اپنے دیہاتی لہجے میں گاتی تھیں۔ یہ سب نظارہ دیکھ کر میرا دل یہ قبول کیے بغیر نہ رہا کہ حکومت کی رپورٹ میں جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ تحریک تو ایک مصنوعی تحریک ہے اور عوام پر ان کی خواہش کے خلاف لاد دی گئی ہے۔ اگر نرم سے نرم لفظوں میں بھی کہوں تو——— بالکل جھوٹ ہے۔"

اس خط کا یہ اثر ہوا کہ غیر جانب دار لوگ بھی حکومت پر سمجھوتے کے لیے زور ڈالنے لگے۔ انگلستان میں بھی بے چینی ظاہر ہونے لگی مگر حکومت اب بھی اپنی جگہ اٹل تھی۔ وہ صرف دھمکی بھرے بیانات ہی دیتی رہی مگر یہ صرف بارش سے پہلے کی گرج ہی ثابت ہوئی۔ حکومتِ بمبئی کی کونسل کے ایک رکن سر چنی لال مہتا نے شری منشی کو گاندھی جی اور شری ولبھ بھائی کے پاس روانہ کیا۔ سمجھوتے کا ایک مسودہ تیار کیا گیا اور اس طرح بات چل نکلی۔

اسی زمانے میں گاندھی جی باردولی آئے۔ چند کسان ان سے ملے۔ ان میں سے ایک کسان کا تعارف کراتے ہوئے ایک ساتھی نے کہا، "یہ ولبھ بھائی سے کہنے آئے ہیں کہ ہم نے اپنا سر آپ کو دیا ہے اپنی ناک نہیں دی ہے۔"

یعنی ہمیں اپنی عزت کا سودا نہیں کرنا ہے۔ ایسا حوصلہ تھا باردولی کے کسانوں میں! گولی چلنے کی بات چلی تو ایک کسان نے کہا تھا: "گولی سے سرکار کتنوں کو مارے گی۔ پلیگ سے جتنے لوگ مر رہے تھے ان سے زیادہ گولی سے نہیں مریں گے۔ میرے ہی گانو میں پلیگ سے چار سو آدمیوں کی موت ہوئی تھی۔"

حکومت کو بالآخر جھکنا پڑا۔ سمجھوتہ ہوا۔ سمجھوتے میں کہا گیا تھا کہ تحقیقات کی جائے گی۔ اسی کے بعد محصول کا فیصلہ ہوگا۔ ضبط کی گئی زمینیں کسانوں کو واپس کر دی جائیں گی۔ ستیہ گرہی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ نیز سارے پٹیلوں، پٹواریوں کو پھر سے ان کی ملازمتوں پر واپس لے لیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ باردولی کے بہادر کسانوں کی جے جے کار ہونے لگی۔

گاندھی جی نے "باردولی کا سردار" کہہ کر ولبھ بھائی کی عزت کی۔

اس دن سے وہ واقعی 'سردار' بن گئے۔ پورے ہندستان کے رہنما! لیکن

ان کی کسر نفسی اسی طرح برقرار رہی ۔ کہنے لگے: "باپو کے پیغام کو ٹوٹی پھوٹی شکل میں بھی ملک کے عوام تک پہونچانے والے کتنے کم لوگ ہیں۔ ویسے ہم ہیں ہی کیا۔ ہم نے کیا ہی کیا ہے ۔ باپو نے بلا وجہ ہمیں اتنا چڑھا دیا ہے۔"

اپنوں کے بیچ

وہ لوگ جو اپنے آپ کو ملک کے لیے وقف کر دیتے ہیں، ان کے خاندان کی حدیں بھی لامحدود ہو جاتی ہیں۔ سردار تو وکالت کرتے ہوئے ہی تیس برس کی عمر میں رنڈوے ہو چکے تھے۔ اس وقت ان کی ایک بیٹی (منی بین) اور ایک بیٹا (ڈاہیا بھائی) تھا۔ بیٹا تو اس وقت اپنے پیروں پر چل بھی نہیں سکتا تھا، پھر بھی دوسری شادی کا خیال ان کے دل میں نہیں آیا مگر دوسرے لوگوں کو کون روک سکتا تھا۔ ایک مجسٹریٹ ان پر بہت زور ڈال رہے تھے۔ ایک دن مذاق ہی مذاق میں ولبھ بھائی نے کہا: "جیون کے بندھن کوئی یکایک بند ھتے ہیں۔ دس پندرہ دن کے اچھے میل جول کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے اس بات کو نہایت ہی سنجیدگی سے لیا اور اپنی لڑکی کو گودھرا بلا بھیجا مگر تب تک ولبھ بھائی تو اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت بیرسٹر بننے انگلستان روانہ ہو چکے تھے۔

وہ پانچ بھائی تھے مگر شہرت پائی صرف دو بھائیوں: وٹھل بھائی اور ولبھ بھائی نے ہی۔ ان دونوں کے درمیان زبردست اختلاف رائے تھا۔ میدانِ سیاست میں دونوں خوب خوب لڑتے تھے مگر گھر میں بھائی بھائی تھے اور ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ وٹھل بھائی جب بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے تو اس کے بعد ان کی اہلیہ سردار کے پاس ہی رہیں۔ وہ ذرا سخت مزاج خاتون تھیں۔ سردار کی اہلیہ سے عموماً ان کی نہیں بنتی تھی۔ چنانچہ سردار نے اپنی اہلیہ کو اس کے مائکے روانہ کر دیا اور اپنی بڑی بھاوج سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

وٹھل بھائی بہت جلد ہی سماج سیوا میں لگ گئے۔ اس طرح ان کے خاندان کا بوجھ بھی ولبھ بھائی ہی اٹھاتے تھے۔ جب بھی بڑے بھائی سردار کے پاس آتے، سردار ان کے جوتے کے

فیتے کھول کر ان کا استقبال کرتے ان کا بستر بچھاتے اور جب وہ لوٹنے لگتے تو ان کی جیب نوٹوں سے بھر دیتے۔ دونوں میں سے کوئی ایک لفظ بھی کبھی نہیں بولتا تھا لیکن خاموشی کا اپنا پن تو ہزار زبان سے گویا تھا۔

بڑے پٹیل جتنے لڑاکو تھے، اتنے ہی پُرمذاق بھی تھے۔ کبھی کبھی تو بڑے بھیانک مذاق کر جاتے تھے حتیٰ کہ لوگ ان کے دُشمن تک بن جاتے۔ ایک بار وہ سردار کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے کہ چند احباب آ گئے۔ باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ اسی درمیان سردار پاخانے چلے گئے۔ بڑے پٹیل نے دیکھا۔ خاموشی سے اُٹھے اور باہر سے پاخانے کی کُنڈی لگا دی۔ پھر دوستوں سے کہا، "یہ ہیں آپ کے سردار! سوراج مانگتے ہیں۔ پاخانے کی کُنڈی کھول کر باہر آ جائیں تو جانیں۔"

آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ بڑے پٹیل دوستوں سے باتیں کرتے رہے۔ سردار اندر ہی بیٹھے رہے۔ ایک بار بھی کُنڈی کھٹکھٹائی نہیں۔ بالآخر بڑے پٹیل اُٹھے اور کُنڈی کھول آئے۔ سردار اسی خاموشی سے باہر آئے اور کام میں لگ گئے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ان کی بیٹی منی بین نے شادی نہیں کی۔ انھوں نے مکمل طور پر اپنے آپ کو باپ کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ ان کی پبلک لائف میں ہمیشہ ان کی ڈھال، ان کی نرس، ان کی ماں بن کر ان کے ساتھ رہیں۔

تاریخ میں ایسی مثالیں نایاب ہیں۔ ولبھ بھائی بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی زبان نہیں کھولتے تھے مگر منی بین ان کے کچھ کہے بغیر ہی سب کچھ سمجھ لیتی تھیں۔ وہ خود بھی بہت کم گو تھیں لیکن دل کی زبان وسیلۂ اظہار کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ مؤثر اور واضح ہوتی ہے اس لیے وہ ہر ممکن انھیں زیادہ سے زیادہ آرام پہونچانے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس کے لیے انھیں ملنے والوں کے ساتھ سخت بھی ہونا پڑتا تھا۔ باپ کی خدمت میں رکاوٹ ڈالنے والے کسی بھی شخص کو وہ برداشت نہیں کرتی تھیں۔ سردار ملک کے لیے جیتے تھے اور منی بہن سردار کے لیے۔

ایک بار پیوند لگی ان کی سفید کھدّر کی ساری دیکھ کر شری مہاویر تیاگی نے منی بین سے پوچھا "سردار سے ملنے راجے، مہاراجے ملکی اور غیر ملکی لوگ آتے رہتے ہیں! تم ایسی ساری کیوں پہنتی ہو؟ اتنے بڑے باپ کی بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر لوگ کیا کہتے ہوں گے؟"

منی بین نے کہا، "سردار کی خدمت سے جو وقت بچتا ہے اس میں چرخہ کاتتی ہوں۔ جو سوت بنتا ہے وہ سردار کے کپڑوں کے لیے ہی مشکل سے پورا ہو پاتا ہے۔ جب ان کے

نئے کپڑے بن جاتے ہیں تو ان کی پرانی دھوتیاں سی کر اپنا کام چلا لیتی ہوں۔"

سردار کے لکھے چند خطوط سے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً جیل سے منی بین اور ڈاہیا بھائی کو لکھے تھے، بچّوں کے تئیں ان کے محبّت بھرے دل کا پتا چلتا ہے۔ ڈاہیا بھائی بھی ان کی ہی طرح رنڈوے ہو گئے تھے۔ ان کی شادی کے سلسلے میں پیغام آتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے منی بین کو لکھا: "ان کا زخم ابھی تازہ ہے۔ اسے بھرنے میں وقت لگے گا۔ ایک دو سال بعد ان کی خواہش دوسری شادی کرنے کی ہو تو بھلے ہی کر لیں اور نہ کرنی ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ اس کام میں کسی کی صلاح کام نہیں دیتی ہے اور کسی کو صلاح دینی بھی نہیں چاہیے۔"

ڈاہیا بھائی کے نام ایک خط میں وہ کتنے پیار سے انھیں سمجھاتے ہیں: "... ... تم دفتر میں جو خطوط لکھتے ہو، ان کی زبان اکھڑ اور مخاطب کو بُری لگنے والی ہوتی ہے۔ دفتر میں کسی کے ساتھ قلم یا زبان کی وجہ سے ہمارا اختلاف ہو یا کسی کو دُکھ پہنچے، اسے کبھی بھی اچھا نہیں مانا جاسکتا۔ تمھارے مکان مالک نے مکان خالی کرنے کے لیے تم پر دعویٰ کر دیا ہے، یہ ہمیں زیب نہیں دیتا۔ تمھارا مزاج ایسا نہیں ہے، پھر ایسا کیوں کر ہو جاتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ تم نے سبھوں کی محبّت اور خلوص حاصل کر لیا ہے، اس لیے بہت خوش ہوا کرتا تھا لیکن یہ باتیں سُن کر ذرا تعجب ہوا۔ اگر کسی کو بری لگنے والی بات لکھ دی ہو تو اس سے معافی مانگ کر اس کے ساتھ گھُل مِل جانا اور اس کی محبّت حاصل کرنا۔ میرا مزاج بھی کسی زمانے میں سخت تھا مگر اس بارے میں مجھے کافی پچھتانا پڑا ہے۔"

منی بین کے نام اپنے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"... ... اب تم تھوڑے وقت کے لیے ڈاہیا بھائی کے ساتھ رہ سکوں گی۔ دونوں بہن بھائی کہیں نہ کہیں وقت اور تنہائی ملنے پر جی بھر کر باتیں کر لینا۔ بار بار موقع نہیں ملتا ہے۔ دلوں کی صفائی کرنی ہو تو کر لینا مگر کوئی نمک نہ لگانا۔ بہت بڑا خاندان، قبیلہ ہونے سے سکھ ملتا ہے، ایسی بات نہیں۔ تھوڑے لوگ ہوں تو ممکن ہے سکھ سے رہ سکیں اور تھوڑا دُکھ بھگتنا پڑے اور پھر سکھ دکھ تو من کے کارن ہی ہوتے ہیں۔"

منی بین کو ایک خط میں پھر لکھا:۔

"اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ برسات آگئی ہے اس لیے چلنا پھرنا کم ہو گیا ہو گا۔ وہاں برآمدے میں گھومنا ممکن ہے، نہیں تو بیرک میں بھی ایک دو گھنٹے ضرور گھومنا چاہیے.... ... پیر اب آرام

ہوگیا ہوگا۔ من کی شکتی حاصل کرنا تو تمھارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ فکر، ایشور کو سونپ دو۔ ماضی کو بھول کر مستقبل کو سدھار لینے میں ہی عقلمندی ہوگی ... ..."

ولایت سے لکھے گئے خطوط میں بھی خاندان کے لیے ان کی ممتا کم نہیں معلوم ہوتی۔ بڑے بھائی کو لکھا گیا ایک خط دیکھیے:۔

"جی۔ کاشی بھائی بالکل ہی خط نہیں لکھتے ہیں چنانچہ گھر کی کوئی خبر نہیں ملتی ہے، اس لیے آپ برابر خط لکھتے رہیں۔

"ہر ایک امتحان ختم ہوگیا ہے اور میں اوّل درجے میں پاس ہوگیا ہوں۔ پوجیہ پتا جی اور ماتا جی کو میرا نمسکار کہیے.... ایشور نے چاہا تو دو سال پورے ہونے میں دیر نہیں لگے گی اور مجھے آپ سبھوں کے درشن کا سو بھاگیہ ملے گا....."

والد سے ان کے تعلقات کیسے تھے، اس سلسلے میں صرف ایک واقعے کا ذکر ہی کافی ہوگا۔ ایک معمر لیکن تندرست اور کسے ہوئے جسم والے بزرگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ انھوں نے سفید پوشاک زیب تن کر رکھی تھی۔ دھوتی، کرتا، کھیس اور پگڑی۔ سبھی کپڑے دودھ کی طرح اُجلے تھے۔

انھیں دیکھتے ہی مُنہ سے حقّے کی نلی نکال کر ولبھ بھائی کھڑے ہوگئے اور بولے، "پتا جی! آپ کہاں سے؟"

"بھائی! تم سے کام پڑا ہے اسی لیے تو آیا ہوں۔"

"مجھے کیوں نہیں بلوا لیا، میں کرم سد آجاتا۔"

"مگر کام بورسد میں ہے اس لیے تمھیں وہاں بلا کر کیا کرتا؟"

"ایسا کیا کام پڑ گیا؟"

"سارے ضلعے میں تمھاری دھاک ہے اور ہمارے مہاراج پر وارنٹ نکلے، کیا یہ مناسب ہے؟ تمھارے رہتے مہاراج کو پولس پکڑ سکتی ہے؟"

"مہاراج پر وارنٹ، یہ کیسے؟ وہ تو پرشوتم بھگوان کے اوتار کہلاتے ہیں۔ ہم سب کو سنسار ساگر سے پار اتارنے والے ہیں۔ بھلا انھیں گرفتار کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟"

"اس وقت تم اپنی دل لگی رہنے دو۔ میں نے بہت ہی معتبر ذرایع سے یہ بات سُنی ہے کہ بوچاسن اور بڑتال کے مندروں کے قبضے کے سلسلے میں جھگڑا ہوا ہے اور اِس میں

ہمارے مہاراج پر بھی وارنٹ نکلے ہیں۔ تمھیں وہ وارنٹ رُکوانا ہی پڑے گا۔ پولس مہاراج کو پکڑ لے، یہ تو میرے ساتھ ساتھ تمھاری بھی عزّت جائے گی۔"

"ہماری عزّت کیوں جائے گی؟ جو ایسا عمل کرے گا اس کی جائے گی۔ لیکن پھر بھی میں اس کی تحقیقات کروں گا۔ وارنٹ یونہی تھوڑے نکلتے ہیں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا میں کروں گا۔"

بعد میں ذرا سنجیدگی سے مگر نرمی کے ساتھ والد کو سمجھایا، "اب آپ ان سادھوؤں کو چھوڑ دیجیے جو اس طرح کے نیچ کام کرتے ہیں، جھگڑے کرکے عدالتوں میں جاتے ہیں، پھر جو اس دنیا میں اپنی حفاظت نہیں کر سکتے وہ دوسری دنیا میں کیا کریں گے اور ہمارا کیا بھلا کریں گے؟"

"ان سب باتوں کو چھوڑو اور دیکھو تمھیں اتنا دھیان رکھنا ہے کہ اگر مہاراج پر وارنٹ نکلا ہو تو وہ رُکنا ہی چاہیے۔"

یہ کہہ کر ان کے والد وہاں سے چلے گئے۔

ان کے کہنے پر سردار نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا اور سمجھوتہ کرا کر دونوں فریقوں کے گرفتار شدگان کو رہا کرا دیا۔[1]

---

[1] سردار ولبھ بھائی پٹیل (حصّہ اوّل)، از نرہری پاریکھ، صفحہ ۳۹۔

جنگِ آزادی کے سپاہی

ہماری جنگِ آزادی کی تاریخ میں 1929 کا سال نہایت ہی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس سال کانگریس کے صدر پنڈت نہرو تھے۔ اگرچہ زیادہ تر ریاستیں گاندھی جی کو صدر بنانے کے حق میں تھیں مگر گاندھی جی چاہتے تھے کہ ملک کی باگ ڈور اب نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہو اسی لیے انھوں نے جواہر لال جی کی حمایت میں اپنی پوری قوّت لگا دی۔

اس انتخاب کے ساتھ ہی ہندستان میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ 31 دسمبر 1929 کی رات کے بارہ بجے راوی کے کنارے شری جواہر لال نہرو نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے پورے ملک کے لیے مکمل آزادی کے فیصلے کا اعلان کیا اور پرچمِ آزادی بلند کیا۔

اس کے بعد بہت ہی تیزی سے واقعات رونما ہوئے۔ سَن 1928 میں جو سائمن کمیشن ہندستان آیا تھا اور جس کا پورے ملک نے متحد ہو کر بائیکاٹ کیا تھا، اسی کمیشن کی سفارشوں کی بنیاد پر وائسرائے نے ہندستان کے لیے فیڈرل طرزِ حکومت کے فیصلے کو منظور کر لیا اور لندن میں ساری پارٹیوں کی گول میز کانفرنس بلانے کا اعلان کیا گیا۔

گاندھی جی برٹش حکومت کی چال سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس اعلان کا استقبال کرتے ہوئے اپنی مشہور 11 شرطیں پیش کر دیں۔ مگر جیسا کہ ظاہر ہے، حکومت انھیں منظور کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ان شرطوں میں نمک ٹیکس رد کر دینے کی بھی ایک شرط تھی۔ اسی سوال کو لے کر گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا اور 12 مارچ 1930 کو وہ اپنے مشہورِ زمانہ 'ڈانڈی مارچ' پر روانہ ہو گئے۔

اس مارچ کا سارا منصوبہ سردار کی نگرانی میں تیار ہوا تھا۔ ادھر گاندھی جی کوچ کی تیاری

میں لگے اور اُدھر سردار گجرات کا دورہ کرنے لگے۔ اسی دوران اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا:

"اب ایک ایسا دھرم یدھ شروع ہوتا ہے جسے دنیا نے اب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جس میں ایک جانب خیر اپنی پوری قوّتوں کے ساتھ ہوگا اور دوسری جانب شر کی پوری قوّتوں اور شیطانی ہتھکنڈوں کا استعمال ہوگا۔ خیر و شر کی اس جنگ میں آپ کا کیا حصّہ ہوگا اور آپ کس کے حق میں لڑیں گے، اس کا فیصلہ خود آپ کو ہی کرنا ہے۔

"سارے گجراتیوں کو میں یہاں سے مخاطب کرنا چاہتا ہوں کہ جنھیں موت کا خوف ستاتا ہو وہ تیرتھ یاترا پر نکل جائیں، اپنی جائداد کا انتظام کر کے یہاں سے روانہ ہو جائیں اور جن کے پاس دولت ہو وہ غیر ممالک کا راستہ لیں۔ اگر آپ سچے گجراتی ہیں تو، ایسا کوئی کام نہ کریں جو آپ کو شرمندہ کرنے والا ہو۔ سر جھکا کر کبھی نہ گھومیں۔ دروازہ بند کر کے گھر میں نہ گھسے رہیں۔ تھوڑے ہی دن باقی ہیں .. .. پندرہ برسوں میں ہمیں جو تعلیم و تربیت ملی ہے، اب اس کا امتحان ہونے والا ہے۔

"گجرات کے عوام تاریخ میں آزادی کا پہلا صفحہ لکھ رہے ہیں۔ ایشور انھیں قوّت عطا کرے۔ ایشور آپ سب کا بھلا کرے۔"

ان کی اس طرح کی تقریروں کا گجرات کے عوام پر زبردست اثر پڑا۔ حکومت بُری طرح گھبرا گئی۔ چنانچہ وہ 7 مارچ 1930 کو ہی گرفتار کر لیے گئے۔ اسی دن تین ماہ کی قیدِ سخت اور 500 روپے جرمانہ اور بصورت عدم ادائیگی تین ہفتے مزید قید کی سزا سُنادی گئی۔ ڈانڈی مارچ پانچ دن بعد یعنی 12 تاریخ سے شروع ہونے والا تھا۔ گاندھی جی نے بس اتنا ہی کہا:

"حکومت نے ولبھ بھائی کو گرفتار کرنے میں جلد بازی کر کے معاملہ بگاڑ دیا ہے۔"

جب وہ رہا ہوئے تو سارا ملک جیل خانہ بنا ہوا تھا۔ وہ بھی اس انوکھے سنگرام میں کُود پڑے۔ پنڈت موتی لال کے بعد وہ صدر کانگریس بنے مگر 13 جون 1930 کو پھر گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں پھر تین ماہ کی سزا ہو گئی۔ نمک ستیہ گرہ کے ساتھ ساتھ گجرات میں ٹیکس بند، تحریک بھی چل رہی تھی اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ سمجھوتے کی باتیں بھی چل رہی تھیں۔ شری تیج بہادر سپرو اور شری جے کر، یروڈا جیل میں گاندھی جی سے کئی بار ملاقات کر چکے تھے۔

اس زمانے میں سردار جیل سے باہر آئے۔ حکومت چاہتی تھی کہ ایسے موقعے پر سردار کوئی تقریر

نہ کریں مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ چنانچہ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں وہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اس بار انھیں نو مہینے کی سزا ہوئی۔

اس وقت انگلستان میں پہلی گول میز کانفرنس ہو رہی تھی۔ ہندستان میں نرم دل کے رہنما کانگریس رہنماؤں کو سمجھا رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 25 جنوری 1931 کو 26 بڑے لیڈروں کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ ان میں سردار پٹیل بھی تھے۔ اس بات چیت کا خاتمہ مشہورِ زمانہ "گاندھی اروِن پیکٹ" پر ہوا۔ لیکن اس معاہدے کے کچھ ہی دن بعد لارڈ اروِن چلے گئے اور ان کی جگہ آئے لارڈ ولنگڈن۔ وہ تھے اقتدار پسند اس لیے وہ سمجھوتہ دیر پا نہ ثابت ہو سکا۔ گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے ضرور مگر ہاتھ کچھ نہیں لگا۔

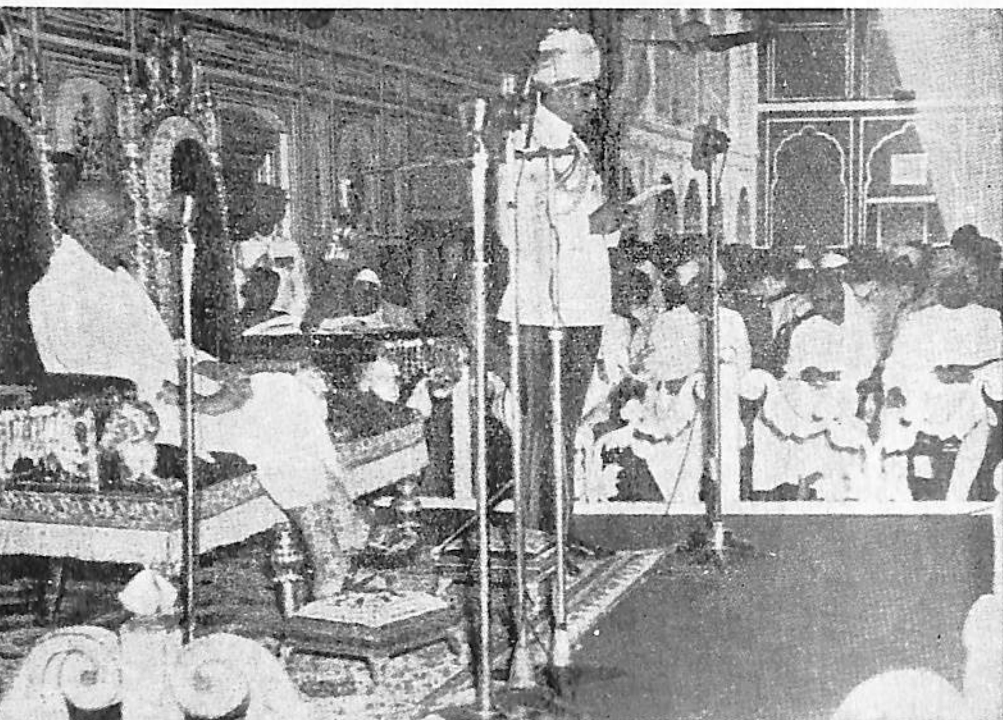
اس سال کانگریس کا اجلاس مارچ میں کراچی میں ہوا تھا۔ صدر تھے ہمارے سردار۔ ان کی صدارتی تقریر سبھی دوسرے صدر حضرات کی تقریروں سے مختصر تھی۔ کسان تقریریں نہیں کرتا ہے، کام کرتا ہے تب ہی تو وہ یہ کہہ سکتے تھے: "میں نے جو تھوڑا بہت کام کیا ہے، اس کے لیے آپ مجھے عزت دے رہے ہیں، میں ایسا نہیں مانتا، ہاں گجرات نے گذشتہ برسوں میں جو قربانیاں دی ہیں آپ ان کی عزت افزائی ضرور کر رہے ہیں۔" ہمارے سردار کے دورِ صدارت میں ہی کانگریس نے اپنے مشہور اقتصادی پروگرام کا اعلان کیا۔

جس زمانے میں گاندھی جی انگلستان میں تھے، اس وقت ہندستان میں انگریزی استحصال عروج پر تھا۔ صوبہ سرحد میں کان مزدوروں پر طرح طرح کے ظلم کیے جا رہے تھے۔ گجرات میں حکومت باردولی سمجھوتے پر عمل نہیں کر رہی تھی۔ سردار یہ سب برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کو خط لکھ کر فوراً لوٹ آنے کا مشورہ دیا۔

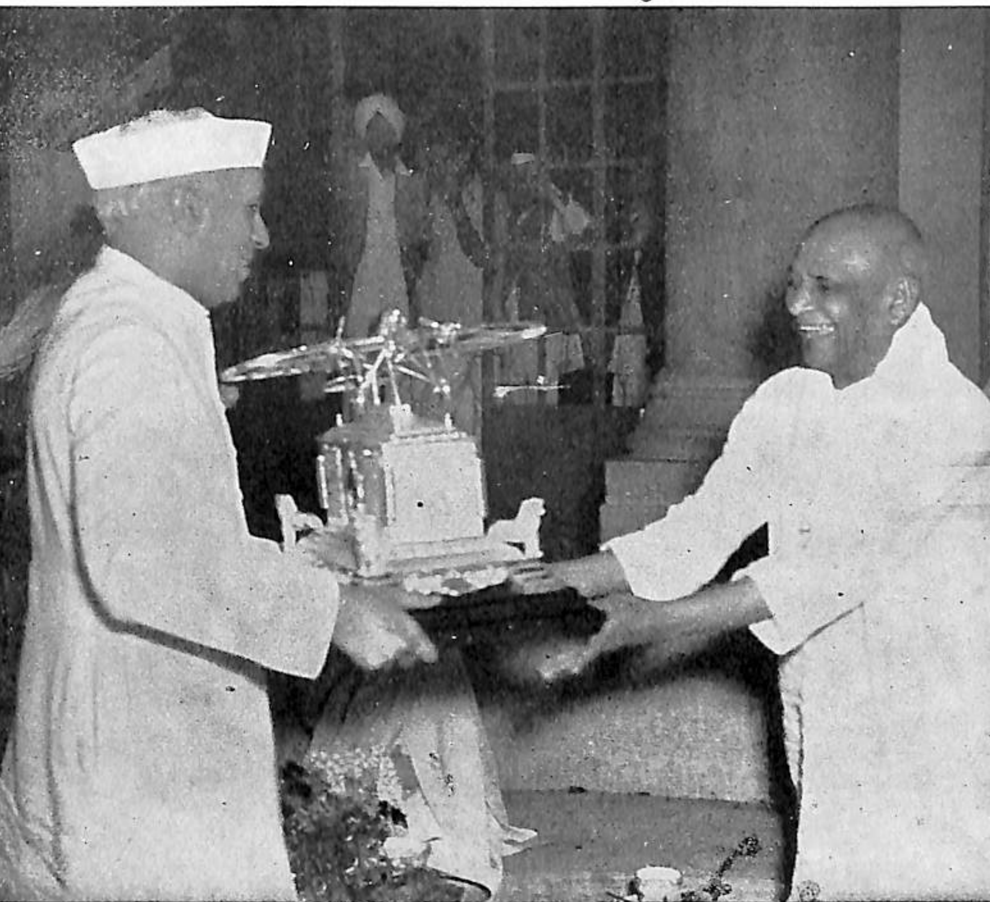
گاندھی جی دسمبر میں واپس آ گئے۔ انھوں نے پوری صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد وائسرائے سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر وائسرائے ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے جواہر لال جی کو پہلے ہی گرفتار کیا ہوا تھا۔ 4 جنوری 1932 کو گاندھی جی اور سردار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ وہ دونوں سولہ مہینے تک ایک ساتھ ہی جیل میں رہے۔

مہادیو بھائی نے اپنی ڈائری میں ان دنوں کے کچھ حالات قلمبند کیے ہیں:

سردار چائے کے شوقین تھے۔ انھوں نے ان سے پوچھا: "کیا آپ نے چائے پینا بند کر دیا ہے؟" سردار بولے "یہاں باپو کے ساتھ اب کیا چائے پییں۔ میں نے تو طے کر لیا ہے



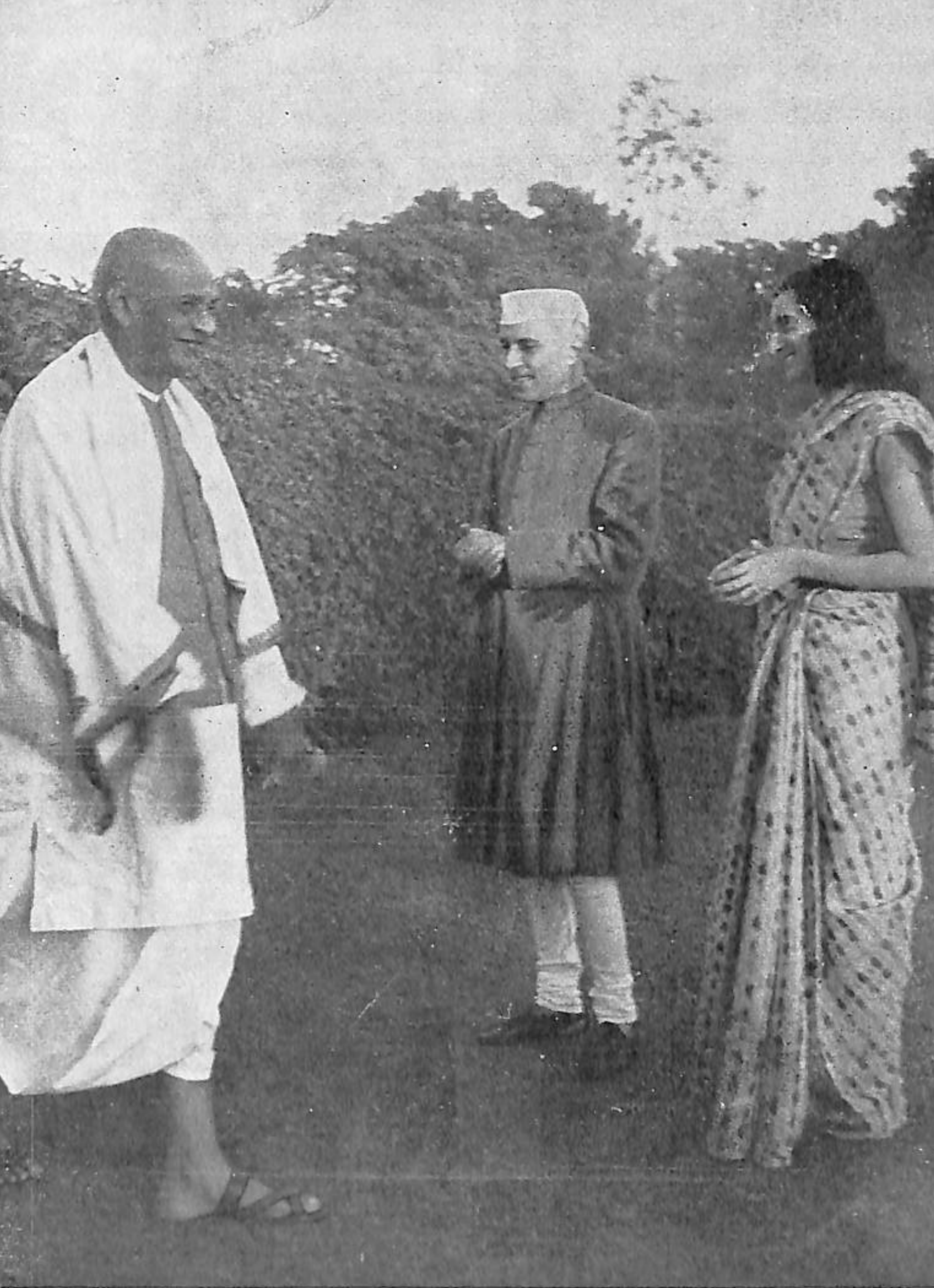
جے پور میں متحدہ راجستھانی ریاستوں، کی افتتاحی تقریب کے موقع پر۔30 جنوری 1949



سردار پٹیل کو لے جانے والے جہاز کا ماڈل، جسے 29 مارچ 1949 کو جے پور میں مجبوراً اترنا پڑا تھا۔ نئی دلی میں آئینی سبھا میں منعقد ایک استقبالیہ جلسے میں یہ یادگار سردار پٹیل کو دیتے ہوئے جواہر لال نہرو۔ 7 اپریل 1949 ــــ بعد میں سردار پٹیل نے اسے فضائیہ کو دے دیا۔



سالگرہ پر آئے ہوئے مبارکباد کے پیغامات کو دیکھتے ہوئے۔ 31 اکتوبر 1949



نہرو اور اندرا کے ساتھ پٹیل



عارضی حکومت میں شامل ہونے کے سوال پر گمبھیر تبادلۂ خیال میں محو۔ گاندھی جی، نہرو اور پٹیل —
جولائی 1946، بمبئی

15 اگست 1947 کو مرکزی وزیر کے عہدے کا حلفِ وفاداری لیتے ہوئے

جنم دن پر اپنے خاندان کے ساتھ ۔ 31 اکتوبر 1948

ڈچ بت تراش کلیراکون کے سامنے بیٹھے ہوئے۔ نومبر 1948

اودے پور کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے۔ 14 جنوری 1949



باردولی آشرم میں چرخہ کاتتے ہوئے۔ جنوری 1949

کہ جو وہ کھائیں گے وہی میں بھی کھاؤں گا۔ چاول چھوڑ دیا اور ساگ اُبالنے کا فیصلہ کیا ہے اور دوبار دودھ روٹی کھانے کا۔ باپو بھی روٹی ہی کھاتے ہیں۔"

خدمت کا یہ حال تھا کہ باپو کے لیے سوڈا بنانے، کھجور صاف کرنے، داتون تیّار کرنے وغیرہ کا کام انھوں نے خود اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ اتنا کرنے پر بھی اطمینان نہ تھا۔ ایک دن ہنستے ہنستے کہنے لگے، "مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں ساتھ رہنے والے ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو کاکا سے پوچھ لیتا کہ باپو کا کیا کیا کام کرنا ہوتا ہے۔ باپو تو خود کچھ کہتے نہیں ہیں اس لیے پتا ہی نہیں چلتا ہے۔"

ایک بار باپو پونے چار کے بجائے تین بجے ہی اُٹھ گئے۔ پرارتھنا وغیرہ کے بعد انھوں نے سردار سے کہا، "آپ باقی نیند پوری کر لیں۔"

سردار بولے، "نہیں ہم تو آپ کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔"

یہ پیچھے پیچھے چلنا صرف لفظی ہی نہیں تھی، سردار کے روئیں روئیں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ اس دن دورانِ گفتگو باپو نے کہا، "کسی نہ کسی دن تو کسی کے کاندھے پر چڑھنا ہی پڑے گا۔" سردار بولے، "نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ملک کو منجدھار میں چھوڑ کر آپ کیسے جا سکتے ہیں؟ ایک دفعہ جہاز کو کنارے پہونچا دیں، پھر جہاں جانا ہو، چلے جائیں۔ میں ساتھ چلوں گا۔"

کوئی یہ نہ سمجھے کہ اتنی بھکتی دیکھ کر باپو ان سے کوئی کام نہ لیتے تھے۔ باپو کو ایک خط لکھوانا تھا۔ مہادیو چرخہ کات رہے تھے۔ باپو نے کہا: "اس کا کاتنا تو ہرگز نہیں چھڑوایا جا سکتا۔" اس پر سردار بولے، "مجھ سے لکھوائیے۔" باپو نے کہا، "آپ خط بھلے ہی لکھیے آپ پر مجھے دیا آئے گی یہ نہ سمجھیے گا۔" پھر صرف خط ہی نہیں لکھوایا، بلکہ شام کو ایک طویل خط کی نقل بھی کروائی۔ ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ مہادیو بھائی نے ٹوکا تو باپو بولے، "تھک جائیں گے تو چھوڑ دیں گے۔" مگر سردار باپو کا کام کرتے تھکتے کیسے؟

وہ صرف داتون کوٹنے اور بادام پیسنے کا ہی کام نہیں کرتے تھے، بلکہ لفافے بھی بناتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک کتاب کی جلد بھی باندھی۔ ان کے کام کرنے کی صلاحیت کی تعریف خود باپو نے کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"لفافوں میں تو کوئی برابری کر نہیں سکتا۔ لفافے وہ ناپے بغیر بناتے ہیں اور اندازے سے کاٹتے ہیں۔ مگر پھر بھی بالکل برابر کے بنتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ اس میں بہت زیادہ وقت لگا ہو۔ ان کا ڈسپلن حیرت انگیز ہے۔ جو کچھ کرنا ہو، اسے یاد رکھنے کے لیے چھوڑتے

ہی نہیں۔ جیسے ہی سامنے آیا ویسے ہی ختم کرڈالا۔ چرخہ کاتنا جب سے شروع کیا ہے تب سے برابر وقت پر کاتتے ہیں۔ اس طرح سوت میں اور رفتار میں روز ہی سُدھار ہوتی جارہی ہے۔ ہاتھ میں آیا ہوا کام، بھُول جانے کی بات تو شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔''

مگر اتنی تعریف کے باوجود بھی باپو انھیں ڈانٹتے بھی تھے۔

ایک دن صبح نو بجے سوڈا اور نیبو دینے کے وقت باپو نے سردار سے کہا۔ ''کیا آپ کو نرسنگ کا ایک کورس دینے کی ضرورت ہے؟ دیکھیے تو آپ نے چمچہ اوپر سے پکڑنے کی بجائے بالکل مُنہ کے پاس سے پکڑا ہے۔ یہ سارا چمچہ گلاس میں جائے گا۔ اس لیے اس جگہ اسے ہاتھ سے چھونا نہیں چاہیے۔ اور جس رومال سے آپ اپنا مُنہ صاف کرتے ہیں اسی رومال سے آپ نے اسے صاف کیا ہے، یہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ نیز پی چکنے کے بعد گلاس کو یوں ہی اوندھا کر نہیں رکھ دینا چاہیے۔ اگر آپ اس اُمید میں اوندھا کر رکھتے ہوں کہ یہ دھل جاتے ہوں گے تو میں آپ سے کہنا چاہوں گا کہ یہ اکثر بغیر دُھلے ہی رہ جاتے ہیں۔''

مگر، اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ناراض ہونے کا حق صرف باپو کو ہی تھا۔ سردار بھی موقع پر چوکتے نہیں تھے۔ مگر اس کی بنیاد میں ہمیشہ ہی باپو کے لیے محبّت ہی کارفرما رہتی تھی۔

ایک بار باپو نے سونے کے لیے ناریل کی رسّی سے بُنی ہوئی کھاٹ منگوائی۔ اسے دیکھ کر سردار چمک اُٹھے۔ بولے: ''کیا؟ اس پر بھی سوتے ہوں گے گدّے میں ناریل کے ریشے کیا کم ہیں کہ جو ناریل کی رسّی پر سونا ہے؟''

باپو : لیکن دیکھیے تو، یہ کھاٹ کتنی صاف رہ سکتی ہے۔

سردار: آپ بھی خوب ہیں۔ اس پر تو چاروں کونوں پر ناریل باندھنا باقی ہے۔ ایسی بدشکل کھاٹ سے کام نہیں چلے گا۔ اس پر کل نواڑ کسوا دوں گا۔

باپو : نہیں ولبھ بھائی۔ نواڑ میں دھُول بھر جاتی ہے۔ نواڑ دُھلتی نہیں لیکن اس کھاٹ کو لیجیے اس پر پانی انڈیلا نہیں کہ بالکل صاف۔

سردار: نواڑ دھوبی کو دی اور وہ دوسرے دن دُھل کر آگئی۔

باپو : مگر یہ رسّی نکالنی نہیں پڑتی ہے۔ یونہی دُھل سکتی ہے۔

مہادیو: ہاں، باپو، یہ تو گرم پانی سے دھوئی جاسکتی ہے اور اس میں کھٹمل بھی نہیں رہ سکتے۔

سردار: چلو، تم نے بھی اپنی رائے دے دی۔ اس کھاٹ میں لیسو، کھٹمل اتنے ہوتے ہیں کہ پوچھیے

نہیں۔

باپو : میں تو اسی پر سوؤں گا۔ بھلے ہی آپ ایسی نہ منگائیں۔ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں میرے یہاں ایسی ہی کھاٹ کام میں لائی جاتی تھی۔ میری ماں ان پر ادرک چھیلتی تھیں۔

مہادیو : یہ کیا؟ میں سمجھا نہیں۔

باپو : ادرک کا اچار ڈالنا ہوتا تو ادرک کو چاقو سے صاف نہ کر کے کھاٹ پر گھستے تھے جس سے چھلکے سب صاف ہو جاتے۔

سردار : اسی طرح ان مٹھی بھر ہڈیوں پر سے چمڑی اُدھڑ جائے گی اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ نواڑ لگا لیجیے۔

باپو نہیں مانے۔ مگر باپو کے لیے سردار کی ممتا اس واقعے سے ظاہر ہے۔ ساتھ یہ ان کی حاضر دماغی کی بھی مثال ہے۔ حاضر دماغی اور تیکھا مزاج تو سردار کی دولت ہیں۔

کسی سنجیدہ سیاسی بحث کے دوران مولانا آزاد نے کہا۔ "ہاں! یہ حل تو تسلّی بخش ہے"۔ اس پر سردار بولے، "اب تک مولا بخش، اللہ بخش اور خدا بخش کا نام تو سُنا تھا، یہ چوتھا تسلّی بخش کہاں سے آگیا؟"

گاندھی جی کا مزاح تو مشہور زمانہ ہے۔ مگر سردار کی حسِ مزاح عوام پر واضح نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ہولی کے موقع پر بھنگ کی ترنگ میں جب القاب تقسیم کیے جاتے تھے، تب بھی ان کی قسمت میں "ہیوی ٹینک"، جیسے بھاری بھرکم القاب ہی آتے تھے۔ ویسے بھی عموماً ان کا مذاق ٹینک سے کم وزنی نہیں ہوتا تھا۔ سیاسی داؤ پیچ نے ان کی مزاحیہ حس کو تیکھے طنز اور زہریلی ہوشیاری میں بدل دیا تھا۔ اسی وجہ سے عوام انھیں تیز و تند مزاج جانتے تھے مگر ان کے لیے یہ بات کہ سردار بچّوں کی طرح ہنس بھی سکتے ہیں، حیرت انگیز تھی۔ سچ ہے کہ شرارت سے مذاق کرنے میں وہ اتنے ہی ہوشیار تھے، جتنا کہ مخالف کو اپنی زہریلی ہوشیاری سے شکست دینے میں۔ اس کے علاوہ ان کے طنز میں چاہے کتنی ہی کاٹ کیوں نہ ہو، ایک اوچھے انسان کا کمینہ پن، جسے کسی کا مذاق اُڑانے کی فطرت کہی جا سکتی ہے، نہیں تھا۔ سردار دوسروں پر ہنس سکتے تھے تو خود کو بھی ہنسی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ ان کی مزاحیہ حس بہت حد تک سوامی دیانند سرسوتی سے ملتی جلتی تھی۔ ان میں ایک آزاد مزاح بھی تھا اور ایک سخت طنز بھی۔ مگر لطافت کی کمی ان میں کبھی نہیں پائی گئی۔ لطافت کی غیر موجودگی میں مزاح کو شمشان کی ہنسی ہی کہا جا سکتا ہے۔

ایک بار کچھ لوگ گاندھی جی سے ملنے آئے۔ راستے میں سردار مل گئے۔ پوچھا: "کہاں جارہے ہو؟" انھوں نے جواب دیا: "گاندھی جی سے ملنے۔"

سردار: کیوں؟

وہ لوگ: برہمچریہ پر کچھ باتیں کرنی ہیں۔

سردار: ارے، برہمچریہ پر گاندھی جی سے بات کروگے؟ ان کے چار بیٹے ہیں۔ اور سب شادی شدہ ہیں۔ خود ان کی بیوی حیات ہیں۔ وہ برہمچریہ کو کیا جانیں۔ برہمچریہ کی بات تو مجھ سے کرو۔ میرے صرف دو بچے ہیں۔ بہت پہلے میری بیوی کا انتقال ہوگیا، تب سے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔ برہمچاری تو میں ہوں۔

شرارت سے بھرے مذاق کی سب سے بڑی مثال باپو کی لنگوٹی والا قصہ ہے۔ ستیہ گرہ ہفتہ شروع ہونے والا تھا اس لیے پنجابی بھی شروع کرنی تھی۔ مہادیو بھائی نے باپو سے پوچھا، "پنجن کی نانت کیسی ہے؟ آپ سے کتنی بار ٹوٹی ہے۔" باپو نے جواب دیا، "جتن کرنا آتا ہو تو کچھ نہ ٹوٹے۔ شنکرلال نے مجھ سے لی کہ ٹوٹی۔ کاکا نے مجھ سے لی کہ ٹوٹی۔ لیکن میری تو کئی دن چلتی رہتی ہے۔ یہ تو جتن کا کام ہے۔ دیکھو تو یہ لنگوٹی پہنے ہوں، کسی اور کے پاس ہوتی تو کب کی پھٹ چکی ہوتی۔

ولبھ بھائی سُن رہے تھے۔ فوراً بول اُٹھے: "یہ تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ پہنتے ہی نہ ہوں۔ بلکہ کھونٹی پر سنبھال کر رکھ چھوڑی ہو۔"

باپو صبح شام نیبو پانی پیتے تھے۔ گرمیوں میں نیبو مہنگے ہوجاتے ہیں اس لیے باپو نے سردار سے کہا کہ نیبو کی جگہ املی کا استعمال کیا جائے۔ جیل میں املی کے درخت بھی بہت ہیں۔

باپو کی بات پر سردار ہنس پڑے۔ بولے: "املی کے پانی سے ہڈّیاں گل جاتی ہیں۔ بادی بڑھ جاتی ہے۔"

گاندھی جی نے کہا: "اور جمنا لال جی پیتے ہیں تو؟"

ولبھ بھائی بولے، "جمنا لال جی کی ہڈّیوں تک پہونچنے کے لیے املی کو راستہ ہی نہیں ملتا۔"

گاندھی جی کے ایک نکتہ چیں صاحب نے باپو کو ایک کھلا خط لکھا، جس کے آخر میں لکھا:

"آپ کے زمانے میں جینے کی بدقسمتی حاصل کرنے والا۔"

باپو نے کہا: "کہو اسے کیا جواب دیا جائے۔"

ولبھ بھائی بولے: "کہیے کہ زہر کھالے۔"
باپو: نہیں ایسا نہیں۔ یہ کیوں نہ کہیں کہ مجھے زہر دے دو۔
ولبھ بھائی: مگر اس سے اس کے دن کیا پلٹیں گے؟ آپ کو زہر دے دے تو آپ گئے اور اُسے پھانسی کی سزا۔ اس طرح دوبارہ بھی آپ کے ساتھ جنم لینا اس کی قسمت میں رکھا رہے گا۔ اس سے یہی اچھا ہے کہ خود ہی زہر کھالے۔

اوپر سے نظر آنے والے فولادی ڈھانچے میں جیسے پیار بھرا ہو، اس طرح مزاح بھی چھلکا پڑتا ہے باپو سب چیزوں میں سوڈا ڈالنے کو کہتے تھے، اسی لیے کچھ بھی اڑچن پڑے تو سردار کہتے، "سوڈا ڈالو نا۔"

اسی طرح کسی تنقید میں "گاندھی جی کی تعمیری غفلتیں" الفاظ کا استعمال ہوا۔ مہادیو بھائی نے پوچھا۔ "تعمیری غفلت کیسی ہوتی ہے؟"۔ سردار کہنے لگے، "آج تمھاری دال جل گئی تھی، ویسی ہی"۔ یہ سُن کر باپو کھلکھلا پڑے۔

ایک صاحب نے گاندھی جی سے پوچھا: "ہم تین من وزنی جسم لے کر زمین پر چلتے ہیں اس طرح بہت سی چیونٹیاں کُچل جاتی ہیں۔" سردار نے فوراً کہا۔ "انھیں لکھ دیجیے کہ پیر سر پر رکھ کر چلیں۔"

ایک دوسرے صاحب نے لکھا: "عورت بدصورت ہے، اس لیے پسند نہیں۔" سردار نے فوراً کہا ۔ "اسے لکھیے نا کہ آنکھیں پھوڑ کر اس کے ساتھ رہے، پھر کچھ بھی بدصورت نظر نہیں آئے گا۔"

جو کچھ دل میں ہے اس کے اظہار میں کبھی انھیں جھجھک نہیں ہوئی۔ باپو ایک بار اپنے ایک مخالف لیڈر کو اس کے جنم دن پر مبارکباد بھیجنے لگے تو سردار نے بڑی کڑوی باتیں مع ثبوت کے کہیں۔ باپو بولے: "دیکھ لینا یہ سب ان سے کہوں گا، ہاں۔" سردار نے جواب دیا: "ان کے مُنہ پر سب باتیں کہہ سکتا ہوں اور کہی بھی ہیں۔"

کہاوتوں کا ان کے پاس اچھا خاصہ خزانہ تھا کیونکہ جیل میں وہ ان کا استعمال دل کھول کر کرتے تھے۔ بازار سے منگانے والی چیزوں میں باپو ہمیشہ کاٹ چھانٹ کرتے تھے۔ ایک دن اسی بات پر سردار بولے: "آپ بچائیں گے تو جیل والے کھا جائیں گے۔ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح سو کا حساب پورا کردیں گے۔ میاں لوٹے موٹھ موٹھ اور اللہ لوٹے

اونٹ اونٹ!" یہ سن کر باپو مہادیو سے بولے "لو سن لو تمھاری واقفیت کے لیے ایک نئی کہاوت تیار ہے۔"

فن اور ادب سے انھیں کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو بس کسان تھے۔ صرف برتاؤ کی بات سمجھتے تھے۔ ایک دن رویندر ناتھ ٹھاکر اور ان کے شانتی نکیتن کی بات چل رہی تھی۔ سردار نے اپنے شبہہ کا اظہار کیا کہ شانتی نکیتن کیسے چلے گا۔ وہ تو بوڑھے ہو گئے ہیں اور وہاں ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔

باپو بولے: "بھگوان نے اتنی غیر معمولی صلاحیت والا آدمی پیدا کیا ہے تو اسے یہ تو منظور ہوگا نہیں کہ ان کا کام یوں ہی بند ہو جائے۔"

بحث آگے بڑھی تو سردار نے اپنی بات کہی۔ "فنِ مصوری تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے مدرسے کتنے چل سکتے ہیں۔ ہمارا تو کھادی اور چرخہ ہے۔ اس کے لیے باپو تھوڑے ہی چاہییں اگر باپو نہ ہوئے تو دودھا بھائی آکر اسے چلاتے رہیں گے۔ مگر انھوں نے ایسی کوئی چیز نہیں دی جسے لوگ اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور وہ پورے طور سے چلتی رہے۔"

مہادیو بھائی کی ڈائری کے سردار نہ سخت ہیں، نہ نرم، نہ گرہستھ اور نہ سنیاسی! وہ تو کسان ہیں جو اپنے کام سے بخوبی واقف ہے اور جس کا مقصد صرف جے ہے۔ وہ باپو سے پیار کرتے ہیں، وہ ملک سے پیار کرتے ہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے مگر جو کچھ بھی وہ کرتے ان میں سے باپو اور بھارت کی جے جے کار ہی نکلتی تھی۔

ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا: "ان کی نرالی بہادری سے میں اچھی طرح واقف تھا، لیکن میں گذشتہ سولہ مہینے جس طرح رہا، ویسی خوش نصیبی مجھے کبھی نہیں ملی تھی۔ جس طرح انھوں نے مجھے اپنے پیار میں سمو لیا تھا وہ مجھے اپنی ماں کی یاد دلاتا ہے۔ میں اس بات سے قطعی واقف نہیں تھا کہ ان میں ماں کی خصوصیات بھی ہیں۔"

جیل کے قیام کے دوران سردار کے دل کو دوبارہ صدمہ پہونچا۔ نومبر 1932 میں ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ تھیں تو معمر مگر پھر بھی ماں تھیں۔ اس کے بعد جب گاندھی جی کے رہا ہو جانے کے بعد وہ ناسک جیل میں رکھے گئے تو اس وقت ان کے بڑے بھائی وٹھل بھائی پٹیل کا جنیوا میں انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے انھیں گہرا صدمہ پہونچا۔ دونوں بھائیوں میں کافی محبت تھی۔ پھر بھی کسی شرط پر جیل سے باہر آکر ان کی آخری رسومات میں حصہ لینے سے انکار

کردیا۔ ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ خاص طور سے ناک میں تکلیف تھی۔ حکومت آہستہ آہستہ قیدیوں کو رہا کر رہی تھی۔ اس نے جولائی 1934 میں سب سے پہلے سردار کو رہا کردیا۔

گاندھی جی اب ہریجنوں کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ گوری حکومت نے اُونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں میں پھوٹ ڈالنے کی جو سازش تیار کی تھی، اسے ناکام بنانے میں انھوں نے جان کی بازی لگادی تھی۔ انھوں نے ستیہ گرہ بھی موقوف کردیا تھا۔ اس لیے سردار نے سب سے پہلے گجرات ودیا پیٹھ کو منظم کیا۔ اس کے بعد خدمت کے جذبے سے معمور ایک ڈاکٹر بھاسکر پٹیل کو ساتھ لے کر بورسد تعلقے میں پھیلے پلیگ کے خاتمے میں مشغول ہو گئے۔ بعد میں اور بھی کئی لوگ آگئے۔ خود گاندھی جی جیٹ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ میں، آم کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں لگے کیمپ میں سات دن تک رہے۔ عوام کے ساتھ اس طرح مل کر کام کرنے سے ہی قوم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے کہ لیڈر ہمیں صرف ستیہ گرہ تحریک میں ہی کود جانے کو نہیں کہتے ہیں بلکہ جینا بھی سکھاتے ہیں۔

قومی کانگرس کے پچاس برس پورے ہو رہے تھے۔ اس نے گولڈن جبلی منانے کا فیصلہ کیا۔ مرکزی کمیٹی کا انتخاب بھی سر پر تھا۔ ان دونوں پروگراموں کو کامیاب بنانے میں سردار نے اپنی صحت کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ قوم نے بڑے حوصلے کے ساتھ گولڈن جوبلی منائی اور مرکزی ودھان سبھا میں بھی کانگرس کو ہی اکثریت حاصل ہوئی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سن 1937 میں جب صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے تب بھی 11 صوبوں میں سے 8 میں کانگرس کو ہی اکثریت حاصل ہوئی۔

اب کانگرس کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا وہ نئے آئین کے مطابق وزارت بنانا منظور کر کے حکومت چلائے یا نہیں۔ سردار چاہتے تھے کہ وزارت بنانا منظور کرلینا چاہیے۔ انھوں نے گاندھی جی کو بھی راضی کرلیا تھا مگر آخری فیصلے کے لیے کانگرس کی مرکزی کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں اس تجویز کی سب سے زبردست مخالفت پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی۔

آخر میں سردار پٹیل نے کہا: "گذشتہ سیکڑوں برسوں سے ہم حکومت کرنا بھول گئے تھے۔ اب یہ موقع آیا ہے تو اس کا استعمال ہونے دیجیے۔ مستقبل میں کبھی نہ کبھی تو ہمیں

اپنے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہی ہے۔ اس لیے جو صوبے اپنی حکومت چلانے کی طاقت نہیں رکھتے وہ طاقتور صوبوں کے مطالبے کو کیوں نامنظور کریں۔ بنگال اور پنجاب کے ساتھی اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں۔ کس لیے؟ آپ وزارت کا عہدہ منظور کرنا چاہیں، تب بھی نہیں کر سکتے۔ وزارت بنانے کے قابل اکثریت آپ نے انتخابات میں حاصل ہی نہیں کی اس لیے آپ دوسروں سے کہتے ہیں کہ تم بھی وزارت نہ بناؤ، لیکن ایسا کرنے سے ملک کو نقصان ہوگا۔ یہ تجویز ہم نہیں منظور کریں گے تو ہم عقلمند نہیں تسلیم کیے جائیں گے۔ اس لیے جن صوبوں میں ہماری اکثریت ہو وہاں پر کانگریسی وزارت بنانے میں ہی عقلمندی ہوگی۔"

تجویز منظور کرلی گئی۔ آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارت کی تنظیم ہوئی۔ سردار پارلیمنٹری بورڈ کے صدر تھے۔ کبھی کبھی ان کے سامنے بڑے پریشان کن مسئلے آجاتے تھے۔ مثلاً 1934 میں جب مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا تو کانگریس نے بمبئی کا دو سیٹوں کے لیے بمبئی کانگریس کے صدر شری کے۔ ایف۔ نریمان اور ڈاکٹر دیش مکھ کو اپنا اُمیدوار منتخب کیا۔ آزاد امیدوار کی حیثیت سے سرکاؤس جی جہانگیر بھی ایک سیٹ کے لیے انتخاب لڑ رہے تھے۔ شری نریمان چاہتے تھے کہ کانگریس ان کی مخالفت نہ کرے اور اپنا ایک ہی اُمیدوار کھڑا کرے۔ مگر ان کی بات نہیں مانی گئی۔

ایک اچھے ڈسپلنڈ فوجی کی مانند شری نریمان کو چاہیے تھا کہ کانگریس کے فیصلے کو مان لیتے مگر نہ جانے کیوں انھوں نے غلط بہانے بنا کر اپنا نام واپس لے لیا۔ سردار حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے فوراً شری کنہیا لال منشی کو نامزدگی کے کاغذات داخل کرنے کو کہا۔ لیکن نریمان تو یہ چاہتے کہ شری جہانگیر منتخب ہو جائیں۔ اس لیے انھوں نے کچھ اس طرح پروپگنڈہ کیا کہ شری منشی انتخاب ہار گئے۔

سردار بہت ہی دُکھی ہوئے۔ پھر بھی سن 1937 کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں شری نریمان کو ہی اُمیدوار مقرر کیا گیا۔ کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی اور اس نے اپنا لیڈر شری بال گنگا دھر کھیر کو منتخب کیا۔ شری نریمان اس سے بہت ہی خفیف ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ سب کچھ سردار کے اشارے پر ہوا ہے۔ انھوں نے قصداً پارسی برادری کے ساتھ یہ ناانصافی کی ہے۔ اس الزام در الزام کی وجہ سے ماحول بالکل گندہ ہو اُٹھا۔ چنانچہ اس معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کے دو رکن تھے۔ ایک گاندھی جی اور دوسرے شری نریمان کے دوست

پارسی بیرسٹر شری بہادرجی۔

کمیٹی نے سب کی باتیں سُنیں۔ خود تحقیقات کی اور فیصلہ دیا کہ سن 1934 کے اسمبلی کے انتخابات میں شری نریمان نے جو غلطی کی تھی وہ قصداً تھی۔ اس کے لیے وہ قصوروار ہیں۔ نیز شری نریمان نے سردار پر جو الزام عائد کیا ہے اس میں ذرا بھی صداقت نہیں ہے۔

شری نریمان نے پہلے تو اس فیصلے کو منظور کر لیا لیکن بعد میں بدل گئے۔ تب مجلس عاملہ نے انھیں کانگرس میں کسی بھی ذمّے دار عہدہ سنبھالنے کی اہلیت سے محروم قرار دے دیا۔

دوسرا واقعہ بھی کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ اس وقت مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے ڈاکٹر کھیر۔ ہندی صوبوں کے تین وزراء سے ان کی نہیں بنتی تھی۔ پارلیمنٹری بورڈ نے سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ڈاکٹر کھیر اور ان کے حمایتی وزرا نے کانگرس کے قوانین کے خلاف اپنے استعفے گورنر کو بھیج دیے۔ گورنر نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی انھیں منظور کر لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نے باقی وزرا کے استعفوں کا بھی مطالبہ کیا اور ڈاکٹر کھیر سے نئی وزارت بنانے کو کہا۔ ڈاکٹر کھیر نے اس کی بات مان لی۔ یہ قدم بالکل واضح طور سے کانگرس کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔ مجلسِ عاملہ نے سبھی وزرا کو بلایا۔ انھوں نے اپنی غلطی مان لی، اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے مجلسِ عاملہ کے اس مشورے کو بھی مان لیا کہ نئے لیڈر کا انتخاب کیا جائے۔

لیکن بعد میں ڈاکٹر کھیر نے لکھ بھیجا کہ دوسرا لیڈر منتخب کرنے کے لیے وہ پارٹی کی میٹنگ نہیں بلائیں گے۔

مجلسِ عاملہ کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اس قدم کی سخت مخالفت کرے۔ اس نے ڈاکٹر کھیر کو کسی بھی ذمّے دار عہدے کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ مراٹھی بولنے والے صوبے میں اس کا زبردست ردِّعمل ہوا، اور ان کے حملوں کا شکار ہوئے سردار پٹیل۔ صوبائیت کا زہر کس حد تک پھیل سکتا ہے، یہ واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔

دُوسری جنگِ عظیم کے دَوران

فروری 1938 میں کانگرس کا سالانہ اجلاس باردولی تعلقے کے ہری پورا گانویں ہوا شری سبھاش چندر بوس اس کے صدر تھے۔ استقبالیہ کے صدر تھے شری گوپال داس دیسائی، مگر انتظام کی ساری ذمّے داری سردار پر ہی تھی۔ انھوں نے وٹھل نگر کا جیسا انتظام کیا اس کی سب ہی نے تعریف کی۔

مگر ہری پورا کانگرس تو اپنے ایک اور ہی نہایت اہم فیصلے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہندستان دو حصّوں میں تقسیم تھا: برٹش حکومت اور دیسی ریاستیں۔ ابھی تک قومی کانگرس دیسی ریاستوں کی تحریکوں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ ہری پورا کانگرس میں پہلی بار یہ تجویز پاس کی گئی کہ دیسی ریاستوں میں جہاں کہیں بھی عوامی ادارے ہوں یا ایسا کوئی ادارہ ہو، کانگرس اس کے ساتھ تعاون کرے اور اس کی رہنمائی کرے۔

چنانچہ دیسی ریاستوں میں دھڑا دھڑ عوامی ادارے قائم ہونے لگے اور انھوں نے ذمّے دار حکومت کا مطالبہ شروع کیا۔ اس خصوص میں راجکوٹ کی تحریک کئی وجوہ سے مشہور ہے۔ وہاں کے دیوان ویر بالا، سیاست کے ماہر کھلاڑی تھے۔ انھوں نے ریاست کی آمدنی بڑھانے کی غرض سے قمار خانے تک کھول رکھے تھے۔ مزدوروں کو زیادہ گھنٹوں تک کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

رعایا اس ظلم کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس نے شری ڈھیبر بھائی کی قیادت میں ستیہ گرہ شروع کردی۔ وہ صداقت پر تھے اسی لیے آخر میں ان کی فتح ہوئی۔ اس وقت سردار صاحب نے دیوان ویر بالا کو مشورہ دیا کہ وہ ٹھاکر صاحب سے ریاست میں ذمّے دار حکومت

قائم کرنے کے لیے کہیں۔

دیوان ویر بالا نے ایک جانب ٹھاکر سے بات کرنے کا یقین دلایا اور دوسری جانب سازش کر کے ایک انگریز کو ٹھاکر صاحب کا صلاح کار بنا دیا۔ رعایا پر اور ظلم ہونے لگا۔ گرفتاریاں ہوئیں پھر سمجھوتے کی بات چیت چلی۔ اس طرح یہ سلسلہ کئی بار دوہرایا گیا۔ آخر میں گاندھی جی بیچ میں پڑے۔ انھوں نے ٹھاکر صاحب سے ملاقات کی۔ قیدیوں سے بھی ملے۔ پھر اس بات چیت کی بنیاد پر انھوں نے چند تجویزیں تیار کیں اور ٹھاکر صاحب کو لکھوا بھیجا کہ اگر انھوں نے ان تجویزوں کو منظور نہیں کیا تو وہ بھوک ہڑتال شروع کر دیں گے۔

ٹھاکر صاحب نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ گاندھی جی نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ساتھ ہی انھوں نے وائسرائے کو بھی ایک خط لکھا۔ وائسرائے نے اس خط کا فوراً جواب دیا اور ہندستان کے چیف جسٹس سر مارس گوائر کو اس سمجھوتے کی شرطوں کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا۔

گاندھی جی نے اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ چیف جسٹس معاملے کی تحقیقات کرنے لگے۔ آخر میں انھوں نے فیصلہ دیا، "کمیٹی کے دس ارکان میں سے سات ارکان پرجا پریشد کی جانب سے سردار ولبھ بھائی کے مشورے سے ہوں گے۔"

اس واقعے سے دوسرے راجا ہوشیار ہو گئے اور پرجا پریشدیں بھی محافظتِ حقوق کے لیے تیار ہو گئیں۔ یہ ایک نیک فال تھی، مگر اگلے سال خود کانگرس کے اندر زبردست بحران پیدا ہو گیا۔ سن 1939 میں کانگرس کا اجلاس تری پورہ میں ہونے جا رہا تھا۔ اس کی صدارت کے لیے مجلسِ عاملہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام پیش کیا، لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا۔ تب مجلسِ عاملہ نے ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیّا کا نام پیش کیا۔ شری سُبھاش چندر بوس بھی میدان میں تھے۔ انھوں نے مجلسِ عاملہ کے کہنے پر بھی اپنا نام واپس نہیں لیا۔ گاندھی جی اور جواہر لال جی کی بھی بات نہیں مانی۔ انتخاب ہوا اور وہ جیت گئے۔ گاندھی جی نے اسے اپنی شکست سمجھا۔

اس کے بعد کانگرس میں جس طرح کے نامناسب واقعات رونما ہوئے، وہ اس عظیم جماعت کے شایانِ شان نہیں تھے۔ ان دنوں شری سبھاش چندر بوس کی صحت بہت ہی خراب چل رہی تھی۔ وہ تری پورہ کے کھلے اجلاس میں آ بھی نہ سکے۔ مجلسِ عاملہ نے گاندھی جی

کی قیادت میں یقین کرتے ہوئے ان سے گذارش کی کہ مجلسِ عاملہ کے ارکان کا انتخاب وہ گاندھی جی کے مشورے سے کریں۔

صدر کانگرس نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا۔ جواہر لال جی کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ دوریاں بڑھتی گئیں۔ سبھاش بابو نے صدر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جگہ پر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن ماحول اب بھی کشیدہ تھا۔ بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ان کے چند کاموں کی بنا پر سبھاش بابو کو تین برس کے لیے کانگرس سے ہٹا دیا گیا۔ جو کچھ ہوا، بدنصیبی تھی۔ اس سے بھی زیادہ بدنصیبی کی بات یہ تھی کہ اس کے لیے سردار صاحب ہی سب سے زیادہ بنگال کے غصّے کے شکار ہوئے۔

وہ وضاحت پسند تھے، اسی لیے تو لفظوں میں اُلجھنا نہیں آتا تھا۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ انھیں ان کے قریب جا کر ہی پہچانا جا سکتا تھا۔ جو قریب نہیں جاتے تھے وہ انھیں اپنا دشمن سمجھ بیٹھتے تھے۔ سوراشٹر کے ایک راجا نے ان کے لیے کہا تھا: "چرو تر کے ایک کنبی کی کیا طاقت کہ وہ ہمیں اپنی ریاست سے اکھاڑ دے۔" انھوں نے سردار کو قتل کرا دینے کی بھی سازش کی تھی۔ مگر جب وہ سردار کی صحبت میں آئے، ان کو پہچانا، تب وہی راجا صاحب انھیں اپنا بڑا بھائی ماننے لگے۔

کانگرس اس طرح کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی کہ یورپ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ ہٹلر کی قیادت میں جرمنی نے یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تو سارا یورپ ایک ٹک دیکھتا رہا لیکن جب اس نے پولینڈ پر بھی قبضہ کر لیا تب مجبور ہو کر انگلستان اور فرانس وغیرہ دوست ممالک کو اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا پڑا۔

کچھ دنوں بعد ہندستان کے وائسرائے نے بھی اس ملک کو جنگ میں جھونک دیا۔ اس نے عوام کی منتخب شدہ وزارتوں سے صلاح تک نہیں لی۔ دوست ممالک نے صرف اتنا ہی کہا کہ اگر وہ جیتے تو ساری دنیا میں جمہوریت کے لیے دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن کانگرس نے یہ مطالبہ کیا کہ انگلینڈ صاف لفظوں میں کہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندستان میں بھی جمہوریت کا قیام عمل میں آجائے گا۔ گاندھی جی اس تجویز سے متفق نہیں تھے۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ ہندستان کی آزادی کے لیے تشدّد کا استعمال نہ کیا جائے۔ جنگ کی حمایت تشدّد کی حمایت ہے۔ انگلینڈ اس وقت زبردست بحران میں مبتلا ہے۔ ہٹلر کے بموں کی مار سے ان کا محل شاہی

زمین بوس ہوا ہے، ہمیں اس کی مدد بغیر کسی شرط کے کرنی چاہیے۔

مجلسِ عاملہ کے زیادہ تر ارکان، جن میں سردار بھی تھے، گاندھی جی کی اس منطق کو منظور نہ کر سکے۔ سردار نے واضح لفظوں میں کہا: "میں آپ کا حکم بجا لانے کو تیار ہوں، لیکن اگر آپ کہیں کہ اس بارے میں مجھے اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرنا چاہیے تو میں یہ مانتا ہوں کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندستان کو مکمل آزادی دینے کی شرط پر ہی مدد کرنے میں میری کوئی عہد شکنی نہیں ہے۔ عدم تشدد کے راستے ہندستان کو آزادی ملنی چاہیے، آپ کا یہ فلسفہ مجھے عملی معلوم ہوا۔ اس حد تک فلسفۂ عدم تشدّد کو میں نے قبول کر لیا اور میں پورے احترام کے ساتھ اس پر عمل کرتا ہوں، مگر میں یہ نہیں مانتا کہ سوراج حاصل کرنے کے لیے انگریز حکومت کو جنگ میں اخلاقی مدد نیز براہِ راست مدد دینے میں میرا عدم تشدّد کا عہد ٹوٹتا ہے۔ پھر بھی اگر آپ حکم دیں کہ مجھے آپ کے ساتھ رہنا چاہیے تو میں اپنے اختلافات ایک جانب رکھ کر آپ کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔"

پہلی بار گاندھی جی اور سردار کے درمیان اختلافات اُبھر کر سامنے آئے مگر ان میں تلخی ذرا بھی نہ تھی۔ جب گجرات پردیش مجلسِ عاملہ کے 105 ارکان میں سے 100 نے سردار کی حمایت کی تو گاندھی جی خوش ہوئے، بولے: "گجرات تو سردار کا ہے نا؟"

گاندھی جی کانگرس سے علاحدہ ہو گئے، مگر پھر بھی وہ وائسرائے سے ملے اور انھیں صلاح دی کہ کانگرس کا مطالبہ منظور کر لینا چاہیے۔ لیکن حکومت کی نیت صاف نہیں تھی۔ وائسرائے نے کانگرس، مسلم لیگ اور راجاؤں کے درمیان مسلسل پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا: "ان سب باتوں کا فیصلہ جنگ کے زمانے میں کرنا ممکن نہیں ہے۔ بعد میں ساری پارٹیوں سے تبادلۂ خیال کر کے ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

اس بیان کے بعد کانگرس کا حوصلہ سرد پڑ گیا۔ کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں لیکن اب بھی وہ حکومت کی جنگی کوششوں میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ گاندھی جی پھر وائسرائے سے ملے، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

تب سردار پٹیل نے حکومت کی بدنیتی کا پردہ فاش کرتے ہوئے ایک بیان دیا۔ اُنھوں نے جیسے پیشین گوئی کی ـــ "آپ اس جنگ میں اگر شکست کھا گئے تو اپنا سب کچھ کھو دیں گے، اور اگر فتحیاب ہوئے بھی تو اتنا زیادہ کھو کر یہ فتح حاصل ہو گی کہ آپ شکست خوردہ ممالک کی ہی

طرح کمزور بن جائیں گے۔ اس جنگ کے اختتام پر کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے قبضے میں نہیں رہے گا۔ اس سلسلے میں دنیا کے لوگوں کے خیالات و نظریات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔"

سن 1940 میں رام گڈھ میں کانگریس نے بھی اسی مطلب کی تجویز پاس کی۔ اس نے ستیہ گرہ کا اشارا بھی کیا ـــ ابھی بھی وہ سمجھوتہ کرنے کو بے چین تھی، مگر حکومت اپنی اکڑ چھوڑے تب ہی تو سمجھوتہ ہو۔

دورانِ جنگ دوست ممالک کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ جاپان بھی جرمنی کی حمایت میں جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس نے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ہندستان کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ لیکن خوش قسمتی سے اسی وقت روس نے جنگ کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ دوست ممالک کے ساتھ آ گیا۔

ہندستان میں کمیونسٹ خیالات کے حامی لوگ اس سے کافی خوش ہوئے۔ انھوں نے دوست ممالک کے حق میں پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ جاپان کے حملے کا خوف تو تھا ہی، اس لیے انگلینڈ نے غیر ملکی فوجوں کو ہندستان میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ان کو بسانے کے لیے گانو گانو اُجاڑ دیے گئے اور دوسرے طرح طرح کے مظالم ہوئے۔ جب لیڈروں نے اس کی مخالفت کی تو انھیں جنگی کوششوں میں رکاوٹ ڈالنے کے جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ شری جواہر لال نہرو بھی ان میں سے ایک تھے۔ یہ کانگریس کے لیے وارننگ تھی۔ گاندھی جی نے اس کا جواب "شخصی ستیہ گرہ" کے ذریعے دیا۔ 16 اکتوبر 1940 سے اس کی شروعات ہوئی۔ پہلے ستیہ گرہی تھے ونوبا بھاوے۔ دوسرے تھے شری جواہر لال نہرو مگر وہ تو پہلے ہی چار برس کے لیے جیل میں بند کیے جا چکے تھے اس لیے ان کی جگہ ملی سردار صاحب کو۔ انھوں نے 18 نومبر 1940 کو ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر حکومت نے انھیں 17 تاریخ کو ہی گرفتار کر کے سابر متی جیل میں قید کر دیا۔

یہ جنگ بڑی انوکھی تھی۔ ستیہ گرہی جلسے میں جا کر نعرے لگاتا تھا: "جنگ میں نہ دیں گے ایک پائی، نہ جائے گا ایک بھی بھائی۔" پھر کہتا: "جن یا دھن سے برطانیہ کی جنگی کوشش میں مدد دینا غلط ہے۔ جنگ کی مخالفت خاموش عدم تشدد سے کرنی ہے۔"

سردار جب جیل میں تھے تو ان کی غیر حاضری میں حکومت کی پالیسی کی وجہ سے احمد آباد

وغیرہ مقامات پر فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے تھے۔ سردار کے دماغی صدمے کی کوئی انتہا نہ تھی۔ صحت ان کی پہلے ہی خراب تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ انھیں کینسر ہو گیا ہے۔ حکومت نے ڈر کر انھیں رہا کر دیا مگر خوش قسمتی سے وہ کینسر نہیں تھا، آنتوں کا کوئی مرض تھا۔

اِدھر فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے گاندھی جی نے گجرات میں ستیہ گرہ بند کر دیا، اور ادھر جاپان نے ملایا اور برما وغیرہ ممالک پر قبضہ کر لیا۔ ایسی نازک صورت حال دیکھ کر امریکہ نے انگلینڈ سے کہا کہ اسے کسی بھی طرح ہندستان کو مطمئن کرنا چاہیے۔

بالآخر وزیر اعظم چرچل نے اپنی وزارت کے ایک رکن سر اسٹیفرڈ کرپس کو چند تجویزوں کے ساتھ ہندستان روانہ کیا مگر وہ تجویزیں اتنی کھوکھلی تھیں کہ اِن سے کچھ نہ ہو پایا۔ سردار نے کہا: "آج تک ان سے زیادہ کھوکھلی تجاویز ہمارے سامنے کبھی رکھی نہیں گئی تھیں۔ یہ تجویزیں کچھ اس انداز سے ترتیب دی گئی ہیں، جس سے جنگ کے بعد بھی برطانوی اقتدار ہندستان میں اور زیادہ مضبوطی سے قائم رہے۔ اگر ہندستان کو حقیقت میں باہری خطرے کا کامیابی کے ساتھ سامنا کرنا ہو تو اس کی رعایا کے ہاتھ میں مکمّل اقتدار اور آزادی ہونی چاہیے۔ برطانیہ ہندستان کی حفاظت کے لیے نہیں لڑتا ہے بلکہ اس پر اپنا قبضہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے لڑتا ہے۔ اگر انگریز ہندستانیوں کی حفاظت کی خاطر لڑتے ہوتے تو کانگرس کے مطالبے کو منظور کرنے میں انھیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔"

دو ٹوک لفظوں میں سردار نے پوری صورت حال واضح کر دی تھی۔

کڑوا گھونٹ

گاندھی جی جب ساری کوششیں کر کے ناکام ہو گئے تو اُنھوں نے اپنے اس امر فیصلے کا اعلان کیا: ۔" انگریزو، بھارت چھوڑو" انھوں نے انگریزوں کو صلاح دی کہ ، " بھارت جیسے عظیم ملک کو خطرے میں رکھنا بڑا خطرناک ہے۔ جنگ کے اختتام پر جب برطانیہ خود نیم جاں ہو رہا ہو گا تو اس وقت بھارت کے وزن کے بوجھ سے تو دب کر وہ مر ہی جائے گا اس لیے اپنے بھلے کے لیے ہی برطانیہ کو اب بھارت سے چلا جانا چاہیے۔"

عوام سے انھوں نے کہا کہ جب تک انگریز حکومت اس صلاح کو مان کر بھارت سے چلی نہ جائے، اس وقت تک عوام "کریں گے یا مریں گے" کا عہد کر کے ستیہ گرہ کرتے رہیں اور ایسی حالت پیدا کر دیں کہ انگریزوں کے لیے ہندستان میں حکومت کرنا ناممکن ہو جائے۔

کانگرس مجلسِ عاملہ نے بھی آخر میں 14 جولائی 1942 کو وہ تجویز پاس کر دی جس کے مطابق " برطانوی حکومت اگر کانگرس کا مطالبہ منظور نہ کرے تو 1920 کے بعد کانگرس نے سیاسی حقوق اور آزادی حاصل کرنے کے لیے جن جن عدم تشدّدانہ ذریعوں کا استعمال کیا ہے، ان سب کا ایک ساتھ استعمال کرنا اس کا فرض ہو جائے گا۔"

اس تجویز کی حمایت کرنے کے لیے 7 اگست 1942 کو بمبئی مجلسِ عاملہ میں میٹنگ بلائی گئی۔ سردار صاحب کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے پاتی تھی۔ پھر بھی وہ ان تھک محنت کر رہے تھے۔ اُنھوں نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ وہ ممکنہ جنگ کے لیے عوام کو ہوشیار کرنا چاہتے تھے۔ اس تجویز پر انھوں نے جو تقریر کی وہ آگ لگا دینے والی تھی۔ انھوں نے کہا: " یہ تحریک بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب کچھ سلامت رہے گا، ہمارا کاروبار چلتا رہے گا، یا بہت ہوا تو ہم جیل میں جا بیٹھیں گے۔ وہاں کھائیں گے، کتابیں پڑھیں گے

اور شان بڑھائیں گے، تو آپ یہ تجویز نہ پاس کریں۔ لیکن اگر آپ کا اٹل فیصلہ ہو کہ اس تحریک میں آزادی حاصل کرنے کے لیے مرجانے کا بھی موقع آجائے تو مرجائیں گے، فنا ہو جائیں گے، تب ہی آگے بڑھیں۔ اور یہ بھی مان کر چلنا ہوگا کہ اس تحریک سے، اس لڑائی سے جو کچھ حاصل ہوگا۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیئے۔ ایسا فیصلہ ہو تب ہی آپ اس تحریک میں شامل ہوں۔"

مجلسِ عاملہ نے 18 اگست 1942 کو بھاری اکثریت سے اس تجویز کو پاس کر دیا۔ دوسرے دن صبح ہی حکومت نے دوسرے لیڈروں کے ساتھ سردار صاحب کو بھی گرفتار کر کے احمد نگر کے قلعے میں قید کر دیا۔ سارا ملک ایک لمحہ کے لیے ساکت رہ گیا، لیکن دوسرے ہی لمحہ عوام کا غصہ اُبل پڑا۔ گاندھی جی منتر تو دے ہی گئے تھے کہ سب اپنے لیڈر آپ ہوں گے۔ چنانچہ سرکاری اداروں پر دھاوا بولا جانے لگا۔ ریل کی پٹریاں اُکھاڑ دی گئیں۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے گئے۔ پولس اسٹیشن بھی نہیں بچے۔ ادھر سرکار نے بھی ظلم کی انتہا کر دی۔ گولی چلانا اور گولی کھانا جیسے کھیل تماشا بن گیا تھا۔ سارا ملک ایک بہت بڑے جیل خانے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ظلم کے کالے دھوئیں نے سارے ماحول کو گندہ کر دیا۔ چاروں جانب ہاہاکار، چیخ پکار اور تباہی مچ گئی۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 60 000 سے زیادہ لوگوں کی گرفتاری ہوئی، 18000 سے زیادہ نظر بند ہوئے، 00 25 سے زیادہ مارے گئے یا گھائل ہوئے — کروڑوں روپیہ جرمانہ ہوا۔ ہزاروں مکان نذرِ آتش ہوئے۔ عوام پر گولی چلانے کے لیے ہوائی جہازوں کا استعمال کیا گیا۔ اس طرح آزادی کی اس جدّوجہد میں ملک کے چہیتے سپوتوں نے اپنی جانوں کی قربانی دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

دوسری جانب عالمی جنگ بھی تباہی کے کنارے پر پہونچ رہی تھی۔ جاپان کی آنکھ بھارت پر لگی تھی۔ بنگال کی کھاڑی میں ہلچل تھی۔ جہاز اس کے آسمانوں پر منڈلا رہے تھے۔ شری سبھاش چندر بوس 1941 میں ہندستان سے نکل بھاگے تھے۔ انھوں نے آزاد ہند فوج کی بنیاد ڈالی اور دسمبر 1943 میں جاپان کی مدد سے باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ بہت جلد ہی پورٹ بلیئر پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ مئی 1944 تک انھوں نے امپھال کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کا مقصد تھا: "دلی چلو" ان کا فیصلہ تھا: "آزادی یا موت"

گاندھی جی پونہ کے آغا خاں محل میں نظر بند تھے۔ 15 اگست 1942 کو ان کے پرسنل سیکریٹری مہادیو بھائی اچانک انتقال کر گئے۔ 22 فروری 1944 کو ماں کستوربا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے حکومت کے رویے سے دُکھی ہو کر 9 فروری 1943 سے انھوں نے 21 دنوں کا فاقہ بھی کیا تھا۔ ایک بار تو ان کے بچنے کی اُمید بھی نہ رہی تھی۔ ماں کستوربا کے انتقال کے بعد تو ان کی صحت اور بھی خراب ہو گئی چنانچہ 6 مئی 1944 کو حکومت نے انھیں رہا کر دیا لیکن سردار کو نہیں چھوڑا۔ وہ احمد نگر کے قلعے میں تھے۔ آنتوں کا پُرانا مرض انھیں پھر تکلیف دینے لگا تھا۔ وہ نہ لیٹ سکتے تھے، نہ کھا سکتے تھے، بس پانی پی کر رہتے تھے۔

اس طرح صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی کہ مئی 1945 میں جنگ ختم ہو گئی۔ دوست ممالک جیت گئے۔ ہندستان کے نئے وائسرائے نے اعلان کیا: "مسئلے کا حل نکالنے کے لیے 25 جون سے شملہ میں سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید ہو گی۔ کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے سبھی ارکان کی رہائی کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔"

15 جون 1945 کو دوسرے لیڈروں کے ساتھ سردار پٹیل بھی رہا کر دیے گئے۔ پہلے وہ گاندھی جی سے ملے۔ پھر لیڈروں کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے شملہ پہونچے مگر اس اجلاس کی بنیاد فرقہ وارانہ تھی اس لیے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مسٹر جناح نے وہاں بڑا سخت رویّہ اپنایا۔ جب کانگرس کے لیڈر جیل میں تھے تب مسلم لیگ نے مسلمانوں پر اپنا کافی اثر جما لیا تھا۔ اس لیے وہ پاکستان لینے کی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اس وقت تک برطانیہ میں مزدور پارٹی کی حکومت بن چکی تھی۔ اس کی پالیسی میں تبدیلی ہونا ضروری تھا چنانچہ 15 اگست کو شاہ انگلستان نے اعلان کیا: "ہندستانی عوام سے کیے گئے وعدوں کے مطابق میری نئی حکومت ہندستانی لیڈروں سے مل کر جلد ہی وہاں مکمّل آزادی کے لیے اپنی پوری کوشش کرے گی۔"

یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ فوج میں بھی بغاوت کی چنگاریاں اُٹھنے لگی تھیں۔ فروری 1946 میں بحریہ نے واقعی بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ برطانیہ نے جیسے مستقبل کا اندازہ لگا لیا ہو، چنانچہ لارڈ پیتھک لارنس کی قیادت میں ایک کیبنٹ مشن ہندستان بھیجا گیا۔ مشن کئی دنوں تک لیڈروں سے بات چیت کرتا رہا۔

مئی 1946 میں اس نے اپنا منصوبہ شایع کر دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ایک کل ہند متحدہ سرکار میں برطانوی ہندستان اور دیسی ریاستیں شامل ہوں گی۔ اس کے ماتحت امورِ خارجہ، دفاع اور آمد و رفت کے محکمے ہوں گے۔ بقیہ امور صوبوں کے ماتحت ہوں گے۔

اگرچہ کانگرس کے لیڈر اس منصوبے سے متفق نہیں تھے، مگر پھر بھی چند ترمیموں کے بعد انھوں نے اس منصوبے کو منظور کر لیا۔ چنانچہ جن صوبوں میں پہلے کانگریسی وزارتیں تھیں وہاں وہ پھر سے اسی طرح بن گئیں۔ 2 ستمبر 1946 کو مرکز میں عبوری سرکار بنی۔ اس کے لیڈر ہوئے: پنڈت جواہر لال نہرو۔ وزارتِ داخلہ سردار ولبھ بھائی کو سونپی گئی۔ مسلم لیگ پہلے تو اس میں شامل نہیں ہوئی، اور جب ہوئی تو اس نے اپنے لیے وزارتِ داخلہ کا مطالبہ کیا۔ لیکن سردار صاحب اسے چھوڑنے پر کسی بھی طرح تیار نہ ہوئے تو مسلم لیگ کو وزارتِ مالیات پر ہی مطمئن ہونا پڑا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سردار صاحب کو ضد نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر ایسا کہنے والوں کو حکومت کا تجربہ نہیں تھا۔ ملک میں اس وقت فرقہ واریت کا زور تھا۔ پولس وزارتِ داخلہ کے ماتحت ہوتی ہے۔ مسلم لیگ ضرور ہی اس کا غلط استعمال کرتی کیونکہ اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کو توڑنے کے لیے اس میں شامل ہوئی ہے۔

اس سے پہلے ہی وہ (16 اگست 1946) 'سیدھی کاروائی' کا دن منا چکی تھی جس کی وجہ کو بے چین ملک اور بھی بے چین ہو چکا تھا۔ پورے ملک میں فرقہ وارانہ فساد ہو رہے تھے۔ ہر چہار جانب حیوانیت کا بول بالا تھا۔ عورت بچّے کسی کی بھی زندگی محفوظ نہیں تھی۔

برطانیہ کے وزیرِ اعظم اعلان کر چکے تھے کہ جون 1948 میں ہندستان کو آزادی دے دی جائے گی۔ لیکن نئے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے دیکھا کہ صورت حال بہت ہی نازک ہے۔ پاکستان کا مطالبہ بھی مضبوط ہو رہا ہے تو انھیں یقین ہو گیا کہ ہندستان اب اور انتظار نہیں کر سکے گا۔ انھوں نے برطانوی حکومت سے بھرپور بات چیت کی اور آخری فیصلے کے طور پر 3 جون کو یہ اعلان کیا کہ ہندستان 15 اگست 1947 کو ایک آزاد ملک قرار دے دیا جائے گا اور مسلم لیگ کا پاکستان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے گا، یعنی ہندستان دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ گاندھی جی تقسیم کی شرط پر آزادی لینے کو تیار نہیں تھے۔

ایسے کشیدہ ماحول میں 14 جون 1947 کو اس منصوبے پر غور کرنے کے لیے کانگرس نے مجلسِ عاملہ کی میٹنگ نئی دہلی میں بلائی۔ سب کے دل غمزدہ تھے۔ پنڈال میں سسکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ ہندستان کے ٹکڑے ہونے جارہے تھے۔ اس وقت سردار اُٹھے۔ ان کا دل بھی بھرا ہوا تھا مگر انھوں نے جو کچھ کہا وہ ان کی اور کانگرس کی حیثیت کو بلا کسی بحث کے واضح کر دیتا ہے۔ "میں زندگی بھر ہندستان کی ایکتا کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ آپ سب کو اس تجویز سے جو دُکھ ہوا ہے اس سے کم مجھے بھی نہیں ہوا ہے۔ مگر میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اس تجویز کو منظور کرنا ہی پڑے گا۔ دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ گذشتہ نوماہ سے ملک کی حکومت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس عرصے میں مجھے بہت زیادہ تکلیف دہ تجربے ہوئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اگر ہم یہ تجویز منظور نہیں کریں گے، اور برطانوی سلطنت نے اسے جس طرح چلنے دیا ہے، ویسا ہی اگر زیادہ دنوں تک چلتا رہا تو مجھے یقینی طور پر یہ ڈر ہے کہ پورا بھارت پاکستان بن جائے گا۔ اس لیے اگر سارے بھارت کو پاکستان بننے سے بچانا ہو تو اس تجویز کو منظور کر کے ملک کی تقسیم کا خطرہ اٹھا کر بھی انگریز حکومت کو بھارت سے ہٹانے میں ہی عقلمندی ہوگی۔ اسی میں ملک کی خوشحالی پوشیدہ ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے میں اپنے غمزدہ دوستوں سے یہ گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس کڑوے گھونٹ کو پی جائیں۔"

گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود بھی، آزادی کی خاطر، وہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا۔

یوم آزادی مُسکرایا

ہندستان آزاد ہوگیا۔ چالیس کروڑ انسان غیر ملکی غلامی کی زنجیر توڑ کر آزاد ہو گئے۔ 15 اگست 1947 کو دو آزاد ملکوں: ہندستان اور پاکستان کا جنم ہوا۔ اگرچہ حیوانیت کے سائے ابھی دور نہیں ہوئے تھے۔ جگہ جگہ پر فرقہ واریت کے شعلے بھڑک رہے تھے مگر پھر بھی ملک نے خوشی سے آزادی کا استقبال کیا۔

آہوتیوں[1] اور بلیدانوں[2] کی بیتی رات اندھیری
بجھے دیپ کے پاس جلے پروانوں کی ہے ڈھیری
امر شہیدوں کی سمرتیوں[3] سے، آج ہر دے بھر آیا
دو شتابدی[4] کی رات کٹی، پھر مکتی دِوس مُسکایا

(چرنجیت)

جگہ جگہ جلسے ہوئے، مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، غریبوں کو کھانا کھلایا گیا۔ شہر بجلی کی روشنی اور گاؤں تیل کے دِیوں سے جگمگا اُٹھے۔ مہاتما گاندھی کی جے تو ذرّے ذرّے سے گونج رہی تھی اور بھارت کا ترنگا قومی پرچم آسمان میں اونچا، اور اونچا لہرا رہا تھا۔

برطانوی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ مگر آزاد بھارت کی پہلی قومی حکومت نے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہی اپنا پہلا گورنر جنرل بنایا۔ سردار نے انھیں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ ان کے دوست بن گئے تھے۔

ہندستان کے پہلے وزیرِ اعظم ہوئے شری جواہر لال نہرو اور نائب وزیرِ اعظم بنے سردار ولبھ

---

[1] قربانیوں [2] قربانیوں [3] یادوں [4] صدیاں

بھائی پٹیل۔ وزارتِ داخلہ کے علاوہ دیسی ریاستوں سے متعلق محکمہ بھی ان کو ہی سونپا گیا۔ انگریز حکومت نے ملک آزاد کرتے وقت ملک کے قریب چھ سو راجاؤں کو بھی آزاد قرار دے دیا تھا۔ انھیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ کسی بھی ملک ہندستان یا پاکستان میں شامل ہو سکتے ہیں۔ کئی راجا یہ بھی سمجھنے لگے تھے کہ وہ مکمّل آزاد ریاست کی حیثیت سے بھی رہ سکتے ہیں۔ مسٹر جناح نے واضح لفظوں میں کہا تھا: "کیبنٹ مشن نے ریاستوں سے متعلق قوانین میں کہیں یہ خیال ظاہر نہیں کیا ہے کہ وہ دونوں ملک میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ منتخب ہی نہیں کر سکتے۔ ریاستیں اپنی خواہش کے مطابق مکمّل طور پر آزاد رہ سکتی ہیں۔"

اس کا مطلب تھا ملک کا سیکڑوں حصّوں میں تقسیم ہو جانا اور ہندستان کی ایک بڑی آبادی کا پہلے سے بھی زیادہ راجاؤں کی استبدادی حکومت میں رہنا۔ ایسی صورت حال میں ان کے حوصلوں کو قابو میں رکھ کر ان سبھوں کو انڈین یونین میں شاملِ کرنے کا کام کتنا مشکل تھا، یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ یہی مشکل کام ہمارے سردار کو کرنا تھا۔

اس وقت اس محکمہ کے سیکریٹری تھے شری مینن۔ ان کے تعاون سے سردار صاحب نے ایک منصوبہ تیّار کیا تھا۔ انھوں نے راجاؤں کو لکھا کہ "ہم سبھوں کا مقصد ایک ہے۔ ہم سب ایک قابلِ فخر وراثت کے حقدار ہیں۔ ہم سب ایک خون اور جذبے سے ساتھ ساتھ بندھے ہیں۔ ...... اور کانگرس آپ کی دشمن نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اُمیّد ہے کہ ہندستان کی دیسی ریاستیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں گی اور مشترکہ فائدے کے لیے ہم تعاون کے جذبے سے اگر کام نہیں لیں گے تو ملک میں لاقانونیت پھیل جائے گی جس کے نتیجے میں ہم سبھوں کی تباہی ہوگی۔"

اس بیان سے راجاؤں کے دل کا ڈر دور ہو گیا۔ سردار کی یہ بات انھیں پسند آئی: "ہمیں غیر ملکی اور غیر ملک کے درمیان ہونے والے قول و قرار اور شرائط نامے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو بھائی بھائی اور مشترکہ فائدے پر غور کرنے کے لیے، ایک ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرنے کی غرض، دل کے اطمینان اور ایسے فیصلوں کے لیے ایک جگہ جمع ہونا چاہیے۔"

اس طرح دونوں فریقین کے درمیان بات چیت شروع ہوئی۔ وہ بار بار ملے۔ کیسی کیسی مشکلیں آئیں۔ ٹراونکور کے دیوان سر سی۔ پی۔ راماسوامی آئر اکڑ گئے۔ انھوں نے اور حیدر آباد کے نظام نے اعلان کر دیا کہ ہم آزاد رہیں گے۔ بھوپال کے نواب بھی گندی گندی چالیں چل رہے تھے۔ جودھپور اور جیسلمیر کو مسٹر جناح اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر آخر میں،

کہیں تو عوامی بغاوت کی وجہ سے، جیسے ٹراونکور میں، کہیں مستقبل کے ڈر سے جیسے حیدرآباد کے نظام، جوناگڈھ کے نواب اور ان کی ماتحت دو چھوٹی مسلم ریاستوں ماگرول اور مانویدر کو چھوڑ کر سبھی بڑے راجاؤں نے تین امور میں انڈین یونین کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تین امور تھے:۔ 1 قومی تحفظ 2 غیر ممالک کے ساتھ تعلقات اور 3 ڈاک تار اور ریل کا نظام۔

جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور تعلقے تھے ان کے ساتھ یہ سمجھوتہ ہوا کہ وہ اسی حالت میں رہیں گے جس طرح آزادی سے قبل تھے۔ یعنی انڈین یونین کے ساتھ ان کے تعلقات ویسے ہی رہیں گے جیسے کہ برطانوی حکومت کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ سے تھے۔

سردار پٹیل نے فراخ دلی اور محبت کی قوت پر اتحاد کا قرارنامہ کچھ اس طرح تیار کیا تھا کہ سبھی راجاؤں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس پر دستخط کردیے۔

جوناگڈھ کسی بھی اعتبار سے پاکستان کے ساتھ ملنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کی اسّی فی صد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ وہاں ہندوؤں اور جینیوں کے کئی مذہبی مقامات تھے، نیز اس کی سرحد کہیں بھی پاکستان سے نہیں ملتی تھی۔ اس لیے نواب کی ضد سے رعایا میں زبردست بے اطمینانی پھیلی۔ اس نے بغاوت کردی اور ایک اندرونی حکومت بھی بنالی۔ یہ دیکھ کر نواب اپنے ہیرے جواہرات اور کچھ کتّے لے کر پاکستان بھاگ گیا۔

اب اندرونی حکومت کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے ریاست کی افواج سے لوہا لیا۔ کچھ لوگ مارے گئے۔ ریاست میں عدم تحفظ کا احساس پھیل گیا۔ دیوان شاہ نواز بھٹو گھبرا گئے۔ انھوں نے مسٹر جناح کو لکھا۔ انھوں نے نواب سے باتیں کیں۔ نواب نے دیوان صاحب کو لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کی مخالفت کے باوجود بھی جوناگڈھ انڈین یونین میں شامل ہوگیا۔

سردار نومبر 1947 میں جوناگڈھ گئے۔ وہ پربھاس پاٹن بھی گئے۔ سومناتھ کا مشہور مندر یہیں ہے۔ وہ کھنڈر بن گیا تھا۔ سردار نے وہاں پر نیا مندر تعمیر کرواکر مہادیو کی مورتی قائم کرانے کا عہد کیا۔ اس عہد کا مُلک کے عوام پر گہرا اثر پڑا۔

سردار صاحب نے ان لوگوں کے ساتھ فراخ دلی سے کام لیا تو کچھ چھپایا بھی نہیں، واضح لفظوں میں (11 اگست 1947) کہہ دیا: "میں ان سے کہتا ہوں کہ 15 اگست کو

جو انڈین یونین میں آگیا وہ آگیا، بعد میں دوسری طرح حساب ہوگا۔ آج تو شرطیں ملتی ہیں وہ پھر نہیں ملیں گی۔ اس لیے راج سنبھالنا ہو تو اندر آجائیے۔ آج کی دنیا میں اکیلا رہنا مشکل ہے۔ جب تیز آندھی آتی ہے تو اکیلا درخت گر جاتا ہے مگر جو دوسرے درختوں کے جھنڈ میں ہوتا ہے وہ بچ جاتا ہے.....

"اس وقت ہندستان کو ایک کرنے کا موقع ہے۔ آج لاہور سے لے کر مشرقی بنگال کا تھوڑا سا حصّہ چھوڑ کر باقی ہندستان کو ایک کرنے کا موقع ایک ہزار سال بعد آیا ہے۔"

عظیم ہندستان کا معمار

آزاد ہندستان کے سامنے مسائل کا انبار تھا۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو کر پاکستان سے آرہے تھے۔ انھیں بسانا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بند کرانا تھا۔ کشمیر پر پاکستان نے حملہ کر دیا تھا۔ حیدر آباد ابھی یونین سے باہر تھا۔ اور بھی مشکلات تھیں مگر ہندستان کے لیڈر گھبرائے نہیں۔ انھوں نے سارے مسائل کا سامنا کیا اور انھیں سلجھایا۔

اڑیسہ اور وسط ہند میں بہت سے چھوٹے چھوٹے رجواڑے تھے۔ اڑیسہ کے ایک رجواڑے کا رقبہ تو صرف 46 مربع میل تھا۔ اتنے چھوٹے رجواڑوں کی آزادی کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ ان کی رعایا بھی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ حقوق طلب کرتے تھے تو جھگڑے ہوتے تھے۔

اڑیسہ سے حیدر آباد کی سرحد ملتی تھی۔ اس نے انگریز پولٹیکل ایجنٹ کی ساز باز سے ان چھوٹے چھوٹے رجواڑوں کو ہڑپنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ بستر میں لوہے کی کانیں تھیں۔ ان ہی کو پٹّے پر لینے کا اس نے فیصلہ کیا۔ سردار صاحب کو پتا چلا تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہاں کے نوجوان راجا کو بلا کر ہوشیار کر دیا۔

لیکن یہی ایک مسئلہ تو نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی الجھن سامنے آتی ہی رہتی تھی۔ اس لیے سردار صاحب اس سوال پر بہت ہی سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ آخر میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ اڑیسہ کے رجواڑوں کو اڑیسہ کے صوبے میں اور وسط ہند کے چھتیس گڈھ کے رجواڑوں کو وسط ہند میں ملایا جائے۔

وہاں کی رعایا تو چاہتی یہی تھی کہ وہ بھی برطانوی ہند کی طرح آزاد ہو۔ راجا یہ سمجھ ہی رہے تھے۔ سردار صاحب نے ان سے باتیں کرتے وقت ان کے سالانہ خرچ اور ذاتی جائداد کے سوال پر بھی غور کیا۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ جن کی آمدنی ایک لاکھ ہے انھیں پندرہ فی صد چار لاکھ کی آمدنی والوں کو دس فی صد، پانچ لاکھ سے دس لاکھ والوں کو ساڑھے سات فی صد حصّہ دیا جائے۔ انھیں کچھ نجی جائداد رکھنے نیز کچھ دوسرے حقوق کی بات کی گئی۔ انہی باتوں کی بنیاد پر وزیرِ قانون نے قرارنامے کا ایک مسودہ تیار کیا۔

13 دسمبر 1947 کو سردار صاحب نے اڑیسہ کے چھوٹے راجاؤں کی میٹنگ بلائی۔ بڑی محبّت سے انھیں سمجھایا کہ ان کے پاس ایسے ذرایع نہیں ہیں جن کی بنیاد پر وہ آزاد ریاست کی حیثیت سے رہ سکیں۔ ان کی بھلائی خود کو ساری ذمہ داریوں سے آزاد کرنے میں ہی ہے۔ اگر اس پر عمل کریں تو حکومتِ ہند ان کے حقوق، مرتبوں، نیز ان کی شان کے تحفّظ کا یقین دلاتی ہے۔

اقتدار سے الگ ہونا تو کوئی آسان کام نہیں ہے (مُنہ کو لگا خون برا ہوتا ہے)، مگر سردار صاحب بھی ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ راجاؤں نے بار بار غور کیا اور آخر میں میور بھنج کو چھوڑ کر چھوٹے بڑے سبھی راجاؤں نے انضمام کے اس قرارنامے کو منظور کر لیا۔ میور بھنج کے راجا کے ہوش بھی ایک برس میں ہی ٹھکانے لگ گئے۔

سردار صاحب نے اس سارے معاملے کی دلچسپ حکایت اس طرح بیان کی ہے۔

"میں ابھی اڑیسہ گیا تھا۔ وہاں چھوٹے موٹے 28 راجا تھے۔ ان کو میں نے سمجھایا، ان چھوٹے چھوٹے کنوؤں کے مینڈک کب تک بنے رہوگے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ راجا ہیں۔ میری پیدائیش کسی شاہی خاندان میں نہیں ہوئی، لیکن آج پورے ملک کی حکومت میں میرا حِصّہ ہے۔ آپ بھی ایسا کام کیوں نہیں کرتے؟ وہ سب راجا میری بات مان گئے اور اب آرام کی نیند سوتے ہیں۔ ان کا بوجھ مجھ پر آ گیا ہے۔ وہاں سے اُڑ کر میں ناگ پور آیا۔ یہاں بھی 18 راجا تھے، جنھیں سلامی ریاستیں کہتے ہیں۔ میں نے بھی ان سے کہا: "سلام! جب میں نے انھیں سمجھایا تو وہ سمجھ گئے اور سبھوں نے دستخط کر دیے۔" گاندھی جی نے یہ خبر سُن کر کہا، "ریاستوں کا انضمام بدہضمی کے شکار بچّوں کو ارنڈی کا جلاب دینے جیسا ہی ہے۔ ایسا کرنے سے دراصل راجاؤں کا ہی بھلا ہوا ہے۔"

اب تو یہ سلسلہ چل پڑا۔ سوراشٹر میں دوسو سے زیادہ چھوٹے بڑے رجواڑے اور تعلقے تھے۔ وہاں بھی مسائل پیدا ہوئے۔ رعایا نے تحریک شروع کی۔ تب بہت ہی غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان سب کو ملاکر متحدہ سوراشٹر بنا دیا جائے۔

15 فروری 1948 کو سردار صاحب نے اس کا افتتاح کیا۔ صدر شری جام صاحب اور وزیر اعلیٰ شری اُچھنگ رائے ڈھیبر بنے۔ اس موقعے پر جام صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے جواہر لال جی نے کہا تھا: "سوراشٹر کے روشن مستقبل اور ترقی کی جانب یہ اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔" ریاستِ کولہاپور بمبئی صوبے کے ساتھ ضم ہوگئی لیکن بڑودہ نے آزاد رہنے کی جی توڑ کوششیں کیں مگر آخر میں وہاں بھی ذمّے دار حکومت قائم ہوئی۔ شرارت کرنے والے مہاراجہ کو گدّی سے اُتار کر ان کے بیٹے کو بڑودہ کا راجا بنایا گیا۔

سردار اکھنڈ بھارت کے لیے بہت بے چین تھے۔ راجستھان یونین کا افتتاح کرنے 30 مارچ 1949 کو وہ جے پور جا رہے تھے۔ راستے میں ان کے جہاز میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ پائلٹ ہوشیار تھا، اس نے فوراً جہاز کو جے پور کے قریب کی ندی کے کنارے کی ریتیلی زمین پر اتار لیا۔ حفاظت سے جے پور پہونچنے پر جب شری مینن جذبات سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹ گئے تو، محبّت بھرے لہجے میں، پوری خود اعتمادی کے ساتھ، ہمارے سردار بولے: "آپ مطمئن رہیں، مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔"

یعنی جب تک اکھنڈ بھارت کا خواب پورا نہیں ہوتا ہے، انھیں کچھ نہیں ہونے والا ہے۔

وسط ہند کے راجا پہلے ہی ضم ہو چکے تھے۔ اب راجستھان بھی یونین میں شامل ہوگیا پھر آئے ہماچل اور پنجاب کے راجا۔ یکم جولائی 1949 کو ٹراونکور۔ کوچین کے متحدہ صوبے کا قیام عمل میں آیا۔ میسور کے راجا نے تو بڑی خوشی کے ساتھ اپنی ریاست کو ہندستان کے ساتھ ضم کر دیا تھا اور راجاؤں کی طرح انھوں نے اپنے پریوی پرس کا بھی ذکر نہیں کیا تھا مگر سردار کیسے بھول سکتے تھے۔ وہ بسترِ علالت پر تھے۔ انھوں نے شری مینن کو بلا کر پوچھا، "میسور کے مہاراجا کے پریوی پرس کی رقم کتنی طے کی؟"

شری مینن بولے، "ابھی تو طے نہیں کی ہے۔"

سردار نے انھیں فوراً میسور جانے کو کہا۔

اس طرح حیدر آباد کو چھوڑ کر سبھی رجواڑوں سے بھارت کا انضمام مکمل ہوا اور سبھی جگہ عوام کی حکومت قائم ہوئی۔

حیدر آباد کی کہانی سننے سے قبل کشمیر سے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔ سب ہی ریاستوں کی طرح کشمیر کو بھی یہ صلاح دی گئی تھی کہ وہ ہندستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ ضم ہو جائے۔ مگر وہاں کے مہاراج ہری سنگھ بھی آزاد ریاست کے خواب دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کو یہ اچھا نہ لگا۔ اس نے پہلے تو اس کے صوبے سے جانے والی اناج وغیرہ ضروری چیزیں بند کر دیں، پھر قبائلیوں کو اکسا کر حملہ کروا دیا۔ اُنھوں نے وہاں رونگٹے کھڑے کر دینے والے جو ظلم کیے ان کا بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کشمیر کی فوج بھی ان کا سامنا نہ کر سکی۔

اب مہاراج کی آنکھیں کھلیں۔ انھوں نے حکومتِ ہند سے مدد مانگی۔ وہاں کی رعایا کے لیڈر شیخ عبداللہ نے بھی گذارش کی۔ سردار صاحب نے اس صورت حال کا استقبال کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ کشمیر کی مدد ضرور کی جائے گی مگر اس سے پہلے اسے ہندستان کے ساتھ ضم ہونا چاہیے۔

مہاراج نے فوراً اقرار نامے پر دستخط کر دیے۔ حکومت ہند نے بھی تیزی سے کارروائی شروع کر دی۔ 27 اکتوبر 1947 کی صبح سیکڑوں ہندستانی فوجی سری نگر پہونچ چکے تھے، حملہ آور اسی دن سے پیچھے ہٹنے لگے اور جلد ہی وہاں کے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ شیخ عبداللہ نے عوام کے نمایندے کی حیثیت سے ریاست کے وزیرِ اعظم کا عہدہ پہلے ہی سنبھال لیا تھا۔

پھر بھی ہندستان کو یہ معاملہ اقوامِ متحدہ میں لے جانا پڑا۔ اس کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو جی کو صلاح دی تھی۔ سردار اس کے مخالف تھے، مگر حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ آج بھی وہ بے معنی سوال اقوامِ متحدہ کی فہرست میں موجود ہے۔

حیدر آباد اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ وہ ہندستان یا پاکستان کسی کے ساتھ ضم نہیں ہوگا۔ وہ ان دونوں کی طرح تیسرے حصّے کی حیثیت سے آزاد رہے گا، مگر برطانوی حکومت نے اسے منظور نہیں کیا۔ پھر بھی نظام داؤ پیچ کر رہا تھا۔ 15 اگست 1947 تک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس برخلاف جنگِ آزادی میں شامل ہونے والوں پر غیر انسانی ظلم کیے۔ وہاں اتحادِ مسلم نام کا ایک ادارہ تھا۔ اس کا لیڈر تھا قاسم رضوی۔ پولس کے ساتھ مل کر اس کے رضاکاروں نے ہندستان کا قومی پرچم جلایا۔ ان حرکتوں کا ذکر ہندستان کے آئینی اجلاس میں خود وزیرِ اعظم

نے کیا تھا مگر نظام نے صاف انکار کردیا۔ اس کے بعد نہ جانے کتنے ڈرامے اس نے کیے۔ پاکستان کے دوست لائق علی کو اس نے اپنا دیوان بنایا۔ اس کے ساتھ مل کر رضا کاروں نے لاقانونیت ہی نہیں پھیلائی بلکہ غیر ممالک سے سامان منگانے کا بھی انتظام کیا۔

سردار صاحب تو پہلے دیکھتے رہے مگر جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو انھوں نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے گورنر جنرل شری راجگوپال آچاریہ اور وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو سے مشورہ کیا اور پولس ایکشن کا فیصلہ کیا۔

نظام کے ہوش ٹھکانے لگنے میں کل 108 گھنٹے لگے۔ 17 ستمبر 1948 کو اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ رضا کار لیڈر گرفتار کر لیے گئے لائق علی پاکستان بھاگ گیا۔ بالآخر 23 نومبر کو نظام نے ایک خصوصی فرمان جاری کر کے حیدر آباد ریاست کو انڈین یونین میں ضم کر دینے کو اعلان کردیا۔

اس طرح ایک ایک کر کے سبھی رجواڑے تاش کے پتّوں کی طرح ڈھیتے چلے گئے اور سردار کا اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہوا۔ انھوں نے ٹوٹے ہوئے ہندستان کے بکھرے ہوئے اعضاء کو جادوگر کی طرح ایک مضبوط جسم میں تبدیل کردیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے نہرو جی نے آئینی اجلاس میں کہا تھا: ”چھ ماہ قبل میں بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آج جو سیکڑوں برس پرانی سامنت شاہی کے پاؤں اُکھڑ رہے ہیں، وہ اتنی آسانی سے اُکھڑ جائیں گے۔ اس ٹیڑھی اور مشکل صورت حال سے نپٹنے کے سلسلے میں ہم پر، میرے دوست و رفیقِ کار نائب وزیر اعظم (سردار ولبھ بھائی) کا احسان ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ہندستان کو عظیم ہندستان بنانے میں سردار پٹیل کی دین تاریخ میں ناقابلِ فراموش رہے گی۔“

واقعی یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا جائزہ لینے وقت مستقبل کا مؤرخ ان کے اس کارنامے کو حصول آزادی سے بھی زیادہ اہم قرار دے گا کیونکہ اس نے تاریخ کے بہاؤ کو موڑ دیا تھا۔

الور کے راجا نے اس تاریخی واقعے کے پانچ سال بعد کہا تھا: ”پہلے تو ہم ان سے ڈرتے تھے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہمارے دل دُکھا کر اقتدار کے زور پر ہمیں ستائیں گے تو لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی کے لیے 1857 میں جیسی بغاوت ہوئی تھی، ویسی ہی بغاوت حکومتِ ہند کے خلاف ہندستانی راجا کردیں گے۔ مگر سردار صاحب نے طاقت

کا چکر ہی نہیں چلایا، انھوں نے تو پریم کی گنگا ہمارے جیون میں بہائی۔ ہمیں اپنے صحیح مقاصد سمجھائے۔ ماں باپ جس طرح اپنے بچّوں کو مطمئن کرتے ہیں، اسی طرح انھوں نے ہمیں مطمئن کیا۔"

اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے بھوپال کے نواب نے انھیں لکھا تھا: "جہاں تک حکومتِ ہند کے ساتھ ضم ہو جانے کے سوال پر میری لڑائی تھی، میں نے اپنی ریاست کی آزادی کے لیے اپنی قوّت کے مطابق ہر ممکن کوشش کی ہے، اس حقیقت کو میں آپ سے چھپانا نہیں چاہتا ہوں۔ مگر میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اب آپ محسوس کریں گے کہ میں آپ کا اتنا ہی وفادار ہوں جتنا سخت مخالف تھا۔ میں اپنے دل میں کسی کے لیے برا جذبہ نہیں رکھتا ہوں کیونکہ آپ نے اور آپ کے لوگوں نے شروع سے ہی میرے تئیں بہت ہی با احترام روّیہ اختیار کیا ہے۔ اب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ملک کے مخالف و تخریب پسند عناصر کا خاتمہ کرنے میں آپ کا عمل پرعزم اور فیصلہ کن رہے گا اور جب تک دیسی ریاستوں کے دوست کی حیثیت سے آپ کا روّیہ برقرار رہے گا تب تک میں آپ کا وفادار اور معتبر دوست بن کر رہوں گا۔" سردار صاحب نے صرف دیسی ریاستوں کا مسئلہ ہی حل نہیں کیا، بلکہ ایک اور مسئلہ بھی سلجھایا۔ سول سروس کے انگریز افسروں پر ہندستانی لیڈروں کو اعتماد نہیں تھا اور افسر یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بغیر آزاد ہندستان کا کام نہیں چل سکتا ہے۔ انھوں نے یہاں رہنے کے لیے دو شرطیں رکھیں: انگریز حکومت کی جانب سے انھیں یہ حق حاصل تھا کہ ایک مقررہ مدّت کے بعد وہ تنخواہ سمیت چھٹی لے کر انگلینڈ جا سکتے ہیں۔ حکومت ہند ان کے اس حق کو برقرار رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ انگریز شہری کی حیثیت سے ہی ہندستان میں رہیں گے۔

سردار صاحب تو چاہتے ہی تھے کہ وہ چلے جائیں۔ یہ ایک سنہرا موقع تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مطالبات کسی بھی طرح منظور نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ افسر خود ہی چلے گئے۔

ان کے پرائیویٹ سیکریٹری شری وی۔ شنکر کے لفظوں میں کہیں تو ــــ سردار 71 برس کے تھے، جب وہ عبوری حکومت میں وزیرِ داخلہ اور اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے آئے۔ وہ 72 برس کے تھے جب نائب وزیرِاعظم کے کاموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے تقسیم ملک کے مسائل کا بھی مقابلہ شروع کیا اور ریاستوں کی ذمّے داری بھی ان ہی کو سونپی گئی۔ ان کی زندگی کے 73، 74 اور 75 ویں سال ملک کو ایک دھاگے میں پرونے، ملک کی

حکومت کے نظم و ضبط کے تانے بانے کو بننے، ملک میں امن قائم کرنے، ملک کے مستقبل کی فارغ البالی کی بنیاد رکھنے نیز حکومتی، قانونی اور اقتصادی نظام کو نئی شکل دینے اور ملک کے آئین کی جمہوری بنیادوں پر تخلیق کرنے میں باری باری سے گذر گئے، اسی وقت وہ 500 سے زیادہ ریاستوں کو ایک آئین کے ماتحت لانے میں کامیاب ہوئے۔ تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی مثال ملے جب کسی سیاستداں یا معمارِ قوم کو ستّر برس کی عمر میں اپنی زندگی کی آخری تین چار برسوں میں اتنی بڑی کامیابیاں ملی ہوں اور زندگی عظیم کارناموں سے بھری ہو، اگر اس کے ساتھ اس بات کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ ان برسوں میں وہ دل کے عارضے میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور ان کے پیٹ کی بیماری بھی خطرناک ہو چلی تھی تو ان کی زندگی کے چار برسوں کے بارے میں جان کر حیرت زدہ رہ جانا پڑے گا۔

ہری سنبھالنا جی

سردار پٹیل کے سخت ڈھانچے میں بسمارک جیسی انتظامی قوّت، چانکیہ جیسا سیاسی تدبّر اور یکجہتی کے لیے ابراہیم لنکن جیسی اٹوٹ محبّت پوشیدہ تھی۔ کسی بھی معاملے کی سمجھ غضب کی تھی۔ ان کے لیے کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جسے وہ سلجھا نہ سکتے ہوں۔ وہ چٹان کی طرح اٹل رہ سکتے تھے تو اپنی باتوں سے قہقہوں کی بارش بھی کر سکتے تھے۔

وہ بہت ہی کم لفظوں کا استعمال کرتے تھے مگر وہ ہوتے تھے بہت ہی معنی خیز۔ زہر کو چاشنی میں لپیٹنا انھیں نہیں آتا تھا۔

ایک بار لارڈ سنکی نے اپنے ایک مضمون میں گاندھی جی سے متعلق بے سروپا باتیں لکھ ڈالی تھیں۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے ایک طویل خط لکھوایا۔ اس وقت ہمارے سردار پاس ہی بیٹھے تھے۔ بولے۔ "اتنا لکھ رہے ہیں۔ اس کے بجائے یہ لکھیے نا کہ تو جھوٹا ہے۔"

وہ گاندھی جی کے اندھ بھکت کہے جاتے تھے مگر وقت پڑنے پر انھوں نے گاندھی جی سے بھی اپنے اختلافات نہیں چھپائے، یہاں تک کہ ان کی خواہش کے خلاف تقسیم ہند کو بھی منظور کرنے سے وہ چوکے نہیں۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ جیسے حالات ہیں ان میں مسئلے کا سب سے بہتر حل یہی ہے۔ یا اگر گاندھی جی ان سے یہ کہتے کہ "میرے اصول کے مطابق ملک کی حکومت نہ چلا سکے تو سرکار سے الگ ہو جاؤ تو وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رُکتے۔ مگر گاندھی جی تو ان کی مشکلات کو سمجھتے تھے، اس لیے اختلافِ رائے کے باوجود دونوں کی محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔

ان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ ہندو قوم پرست تھے اور مسلمانوں کے لیے فرقہ وارانہ

ذہنیت رکھتے تھے، لیکن انھوں نے ہندوؤں سے بھی تو کہا تھا: "کچھ لوگ اس وقت گئو رکشا کی بات کرنے لگے ہیں۔ ابھی تو بچّوں، عورتوں اور بوڑھوں کی حفاظت نہیں ہوپارہی ہے، تب ایسے میں گئو رکشا کی بات ہی کہاں؟ جن ممالک میں گایوں کو ذبح کرنے کی ممانعت نہیں ہے وہاں جیسی ہٹّی کٹّی گائیں پائی جاتی ہیں ویسی یہاں نہیں پائی جاتی ہیں اگر واقعی گئو رکشا کرنی ہو تو گائے کو اچھی طرح پالنا سیکھیے۔"

انھیں ہندو مسلم ایکتا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ انھوں نے اپنے طور پر لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں کی حفاظت کی تھی، مگر وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے تھے: "جن مسلمانوں کو ہندستان کے شہری کی حیثیت سے تحفّظ حاصل کرکے پاکستان کے لیے اپنے دلوں میں وفاداری رکھنی ہو تو وہ ضرور پاکستان جا سکتے ہیں۔ وہاں جانے میں ہی ان کا بھلا ہے۔"

ان کا یہی رُخ بہت سے لوگوں کو کھٹکتا تھا اور وہ بار بار گاندھی جی اور نہرو جی سے شکایت کرتے تھے۔ گاندھی جی بار بار اس جھوٹے پروپیگنڈہ کی مخالفت کرتے تھے۔ کہتے تھے: "ولبھ بھائی نہ تو پہلے کبھی فرقہ پرست تھے نہ آج ہیں۔ مجھے مکمّل یقین ہے کہ وہ ایسا عمل کبھی نہیں کریں گے جس سے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہو۔"

انھوں نے کہا بھی نہیں، مگر ان کے اور جواہر لال جی کے درمیان جو اختلافات تھے وہ کہیں زیادہ ٹھوس تھے۔ اس کی وجہ تھی ان دونوں کے مزاج میں اختلاف۔ جواہر لال جی جذباتی تھے۔ ان کے افکار پر مغرب کا اثر زیادہ تھا۔ سردار قوم پرست تھے اور اس ملک کے عوام کی طرح سوچتے تھے جبکہ نہرو جی ملک کے اندرونی سوالوں پر بھی بین الاقوامی صورت حال کو مدِّنظر رکھ کر سوچتے تھے جبکہ سردار پہلے اپنے گھر کی بات سوچتے تھے، اسی لیے دونوں میں بہت سی باتوں پر اتفاق نہیں تھا۔

دونوں اپنے ملک کو، اپنے ملک کی آزادی کو بے حد پیار کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت کرنی بھی انھیں خوب آتی تھی۔ مگر خود غرض اور حاسد افراد ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی رہے۔ اس بار تو صورت حال اتنی نازک ہو گئی کہ سردار وزارت سے الگ ہونے کو تیار ہو گئے۔ انھوں نے بھرے دل سے گاندھی جی کو لکھا: "ان حالات میں آپ مجھے حکومت سے الگ ہو جانے کی اجازت دیں تو شاید اس سے ملک کا اور میرا بھی زیادہ فایدہ ہوگا۔ ابھی میں جو کام جس ڈھنگ سے کر رہا ہوں اس

سے مختلف طریقے سے ان کاموں کو نہیں کر سکوں گا۔ اگر میں اپنے پرانے ساتھیوں کے لیے بوجھ بن جاؤں اور آپ کی دلی تکلیف کی وجہ بننے پر بھی اپنے عہدے سے چمٹا رہوں تو اس کے معنی ہوں گے۔ اور مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ کہ میں اقتدار کی خواہش میں اندھا ہو گیا ہوں اور اس لیے میں اپنا عہدہ چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں۔ اس ناقابلِ برداشت صورت حال سے آپ مجھے جلد از جلد آزاد کر دیجیے۔"

لیکن اس خط کو لکھنے کے بعد بھی بمبئی میں اپنی تقریر میں انھوں نے اپنی کھری زبان میں کہا: "آپ نے ابھی ابھی یہ نعرے سُنے ہوں گے کہ مسلمانوں کو بھارت سے مار بھگاؤ۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ لوگ غصّے سے پاگل ہو گئے ہیں۔ جو لوگ غصّے میں اپنا ہوش و حواس کھو دیتے ہیں وہ پاگلوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ پاگل آدمی کو تو ٹھیک کیا جا سکتا ہے لیکن غصّہ میں سب کچھ بھول جانے والے کو کیا سِکھایا جا سکتا ہے۔؟ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہندستان میں بچے ہوئے مٹھی بھر مُسلمانوں کو نکال دینے سے انھیں کوئی فایدہ نہیں ہوگا۔ میں صاف بات کہنے والا آدمی ہوں۔"

تب ہی تو گاندھی جی نے کہا تھا: "سردار کا، پنڈت نہرو کا اور میرا، تینوں کا نقطۂ نظر ایک جیسا ہے۔ ہم سب ایک ہی مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔" انھوں نے 30 جنوری 1948 کو جس دن ان کا قتل ہوا، سردار سے واضح لفظوں میں کہا تھا: "میں اس یقینی فیصلے پر پہونچا ہوں کہ کیبنٹ میں آپ دونوں کی خدمات ناگزیر ہیں۔ ایسے نازک وقت میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کا بھی الگ ہونا ملک کے لیے بھیانک ثابت ہوگا۔"

یہ کہنے کے چند ہی منٹوں بعد تو وہ امر ہو گئے مگر سردار اور نہرو جی نے ان کی خواہش کو پورا کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ اختلافات پھر بھی رہے مگر وہ انھیں ساتھ ساتھ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے سے نہ روک سکے۔ سردار صاحب برابر بیمار رہنے لگے تھے مگر محنت اسی طرح کرتے تھے۔ جواہر لال جی کے ساتھ ان کی محبّت ویسی ہی تھی۔ 2 اکتوبر 1950 کو، اپنی موت سے ڈھائی مہینے پہلے بھی انھوں نے کہا تھا:۔

"پنڈت جواہر لال نہرو ہمارے لیڈر ہیں۔ باپو نے انھیں اپنا وارث مقرر کیا ہے اور اس کا اعلان بھی انھوں نے کیا ہے۔ باپو کے سارے سپاہیوں کا فرض ہے کہ وہ جواہر لال جی کے احکامات کو مکمّل طور پر بجا لائیں۔ جو لوگ ان کے احکامات کو دل سے نہیں بجا لاتے وہ بھگوان کے اپرادھی ہیں۔ میں بے وفا سپاہی نہیں ہوں۔ میں جس جگہ پر ہوں اس کے

بارے میں مجھے کبھی خیال بھی نہیں آتا ہے۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ اُنھوں نے مجھے جہاں رکھا تھا میں وہیں ہوں۔"
اس کے بعد کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔

ان کی صحت اب اور بھی گر گئی تھی۔ بار بار دل کے عارضے کا حملہ ہونے لگا تھا! آرام کی غرض سے وہ مسوری اور دہرہ دون بھی گئے۔ مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں نے صلاح دی کہ بمبئی جا کر وہ مکمّل آرام کریں۔

وہ 12 دسمبر 1950 کو بمبئی روانہ ہوئے ضرور مگر موت کے قدموں کی چاپ بھی وہ بالکل واضح طور سے سُن سکتے تھے۔ جاتے وقت ایک دوست سے انھوں نے کہا تھا۔ "اب میری زندگی کا خاتمہ نزدیک آرہا ہے۔"

ایسی حالت میں بھی جانے سے قبل اپنے محکمہ کے افسروں سے ایک گھنٹے تک باتیں کیں۔ انھیں ضروری مشورے دیے۔ انھیں الوداع کہنے ہوائی اڈے پر صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیرِ اعظم پنڈت نہرو بھی آئے تھے۔ اس محبت و پیار سے شرابور ماحول میں سردار صاحب کے آخری الفاظ تھے: "جواہرلال جی کے سر پر بہت بڑا بوجھ ہے۔"

کون جانتا تھا کہ وہ وداع آخری وداع ہے۔ بمبئی پہونچ کر ان کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔ مگر وہ چراغ کی آخری لَو کی طرح تھی۔ دوسرے ہی دن وہ بے چین ہو اُٹھے۔ اس بے چینی میں ان کے مُنہ سے یہی بھجن نکلتا تھا: "میری لاج تمھارے ہاتھ ہے۔ ہری سنبھالنا جی!"

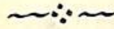
15 دسمبر کی رات میں ان پر پھر دل کے عارضے کا حملہ ہوا۔ وہ بے ہوش ہو گئے اور اُسی حالت میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

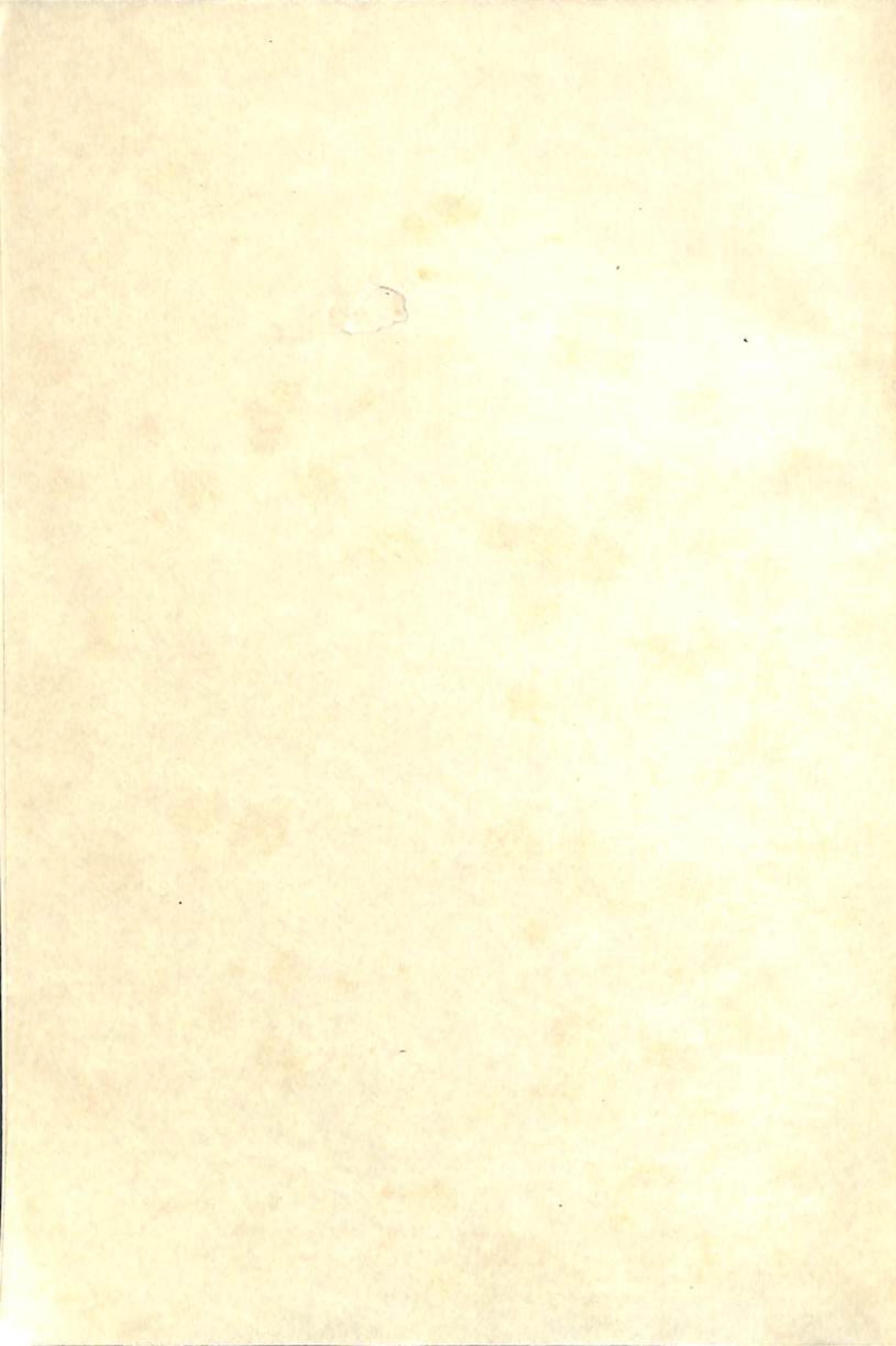
بجلی کی طرح یہ خبر ہر چہار جانب پھیل گئی۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، وزیراعظم پنڈت نہرو اور بہت سے دوسرے سارے لیڈر فوراً بمبئی پہونچ گئے۔ اپنے ساتھی کے اس آخری الوداعی موقعے پر غمزدہ نہرو جی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ اختلافات کے باوجود سردار سے ہی تو انھیں سب سے زیادہ قوت ملتی تھی۔ انھوں نے کہا تھا: "پریشانی اور فتح کے لمحات میں ہم ان کی مضبوط آواز سُنتے تھے۔ وہ ایسے دوست اور رفیقِ کار تھے جن پر مکمّل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ طاقت کے ایسے ستون تھے جس سے کمزور دل بھی مضبوط بن جاتے تھے۔"

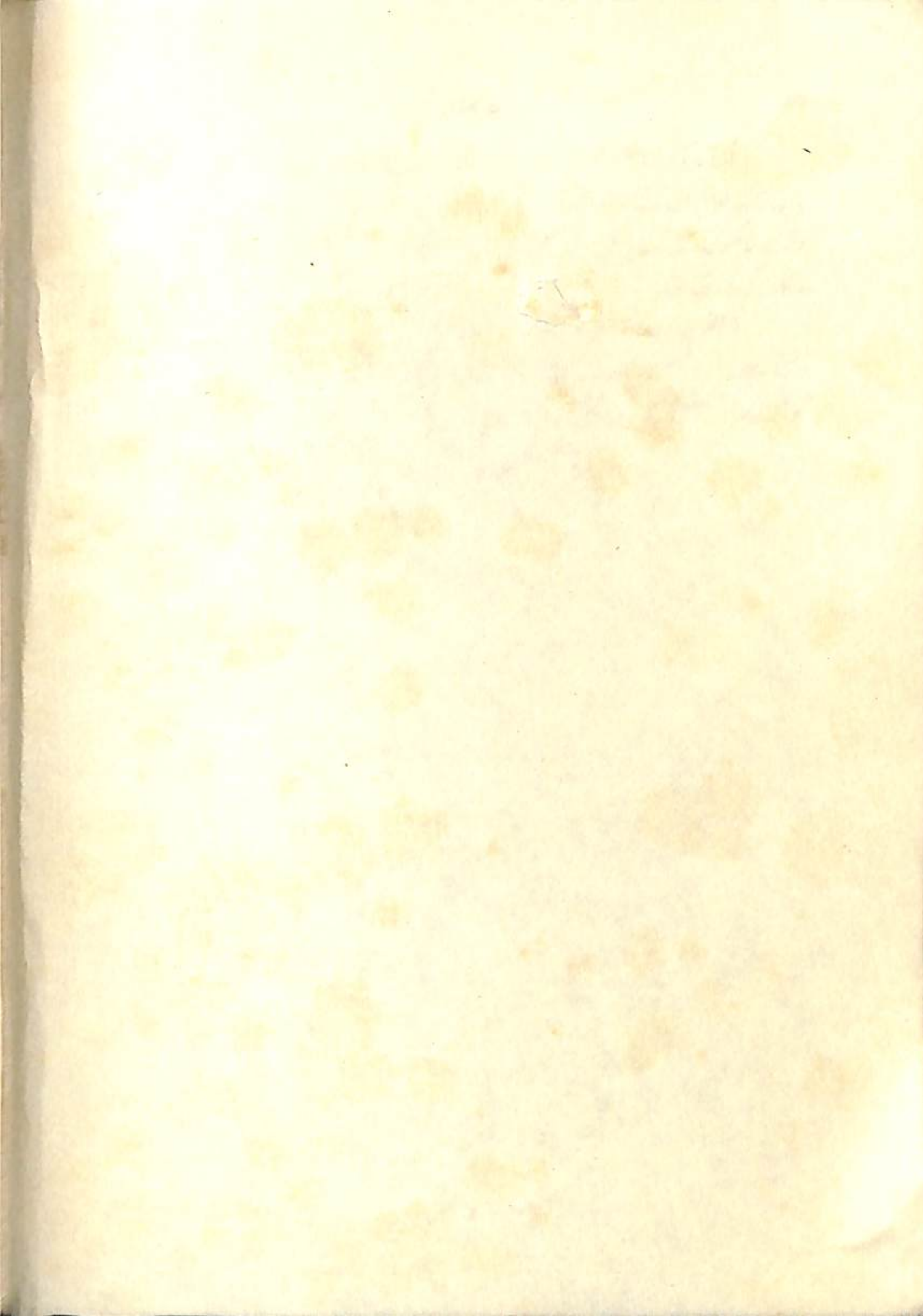
اُن کا آخری سفر بھی ان کے معیار کے مطابق ہی تھا۔ رام دھن اور بھجن گاتے ہوئے پانچ لاکھ عوام ان کے مردہ جسم کو آخری رسومات کی غرض سے شمشان لے کر پہونچے تھے۔ اس وقت لاکھوں گلے سے نکلی اس پاکیزہ دُھن: رگھوپتی راگھو راجارام، پتت پاون سیتارام، سے ماحول گونج اٹھا تھا۔

نہ جنم ہوتا ہے، نہ موت ہوتی ہے، بس روح صداقت کی آخری حدوں کو تلاش کرتی رہتی ہے۔ مردِ آہن سردار ولبّھ بھائی پٹیل کی زندگی جہدِ مسلسل کے سہارے اسی صداقت کی تلاش میں، مستقل سفر کی ایک روشن مثال ہے۔ ان جیسوں کے لیے ہی شاعر نے کہا ہے:۔

پھٹے ہوئے ماتا کے آنچل کو سینے والے
تجھے بدھائی ہے، او پاگل مرکر جینے والے







سردار ولبھ بھائی پٹیل ہندستان کی جنگِ آزادی کے 'مردِ آہن' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سات سو سے زیادہ دلیسی ریاستوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لانے کا کام ان جیسے ذہین سیاستداں کے علاوہ اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ بڑی سے بڑی مصیبت آنے پر بھی ذرا بھی پریشان نہ ہونے والا یہ شخص کم مزاح پسند نہیں تھا۔ سردار پٹیل کی زندگی کے کچھ جانے ان جانے گوشوں کا انکشاف ہندی کے مشہور ادیب شری وشنو پربھاکر نے نہایت ہی پرکشش زبان و اسلوب میں کیا ہے۔

یہ کتاب سردار پٹیل کی صد سالہ جشنِ پیدائش کی ایک کڑی ہے۔

قیمت 7.50

نیشنل بک ٹرسٹ۔ انڈیا